BOOK HOME
FAUST - GOETHE
فاؤسٹ
گوئٹے
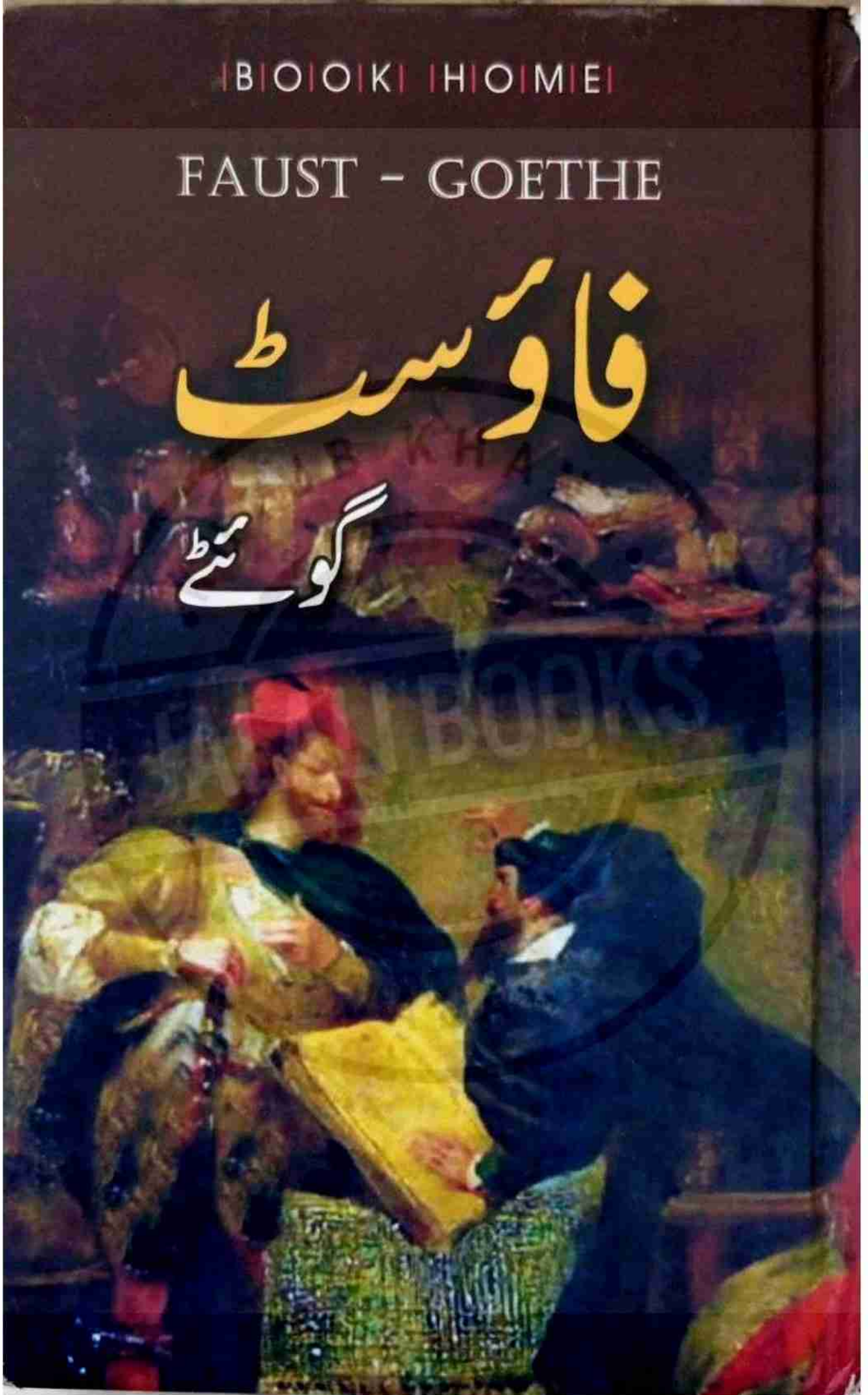
فاؤسٹ

یوحان وولف گانگ گوئٹے

ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

BOOK HOME

FAUST
By: Goethe

فاؤسٹ

یوحان وولف گانگ گوئٹے

ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

اہتمام	رانا عبدالرحمٰن
پروڈکشن	ایم سرور
کمپوزنگ	محمد انور
پرنٹرز	حاجی منیر اینڈ سنز، لاہور
اشاعت	2017ء
قیمت	600 روپے
ناشر	بک ہوم لاہور

بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 042-37231518-37245072
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com

فہرست

باب ششم

گوئٹے کا "فاؤسٹ"

گوئٹے (Goethe) اگرچہ جرمن ادیب تھا لیکن وہ عالمی ادب کے گنے چنے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، ناول نویس، ڈرامانگار اور فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ متنوع اور ہمہ گیر طبیعت کا مالک تھا اور اس کی دلچسپیاں بھی لامحدود تھیں۔ ادب کے علاوہ اس نے قانون، طب، علم کیمیا اور علم برق کی تعلیم بھی حاصل کی۔ وہ سیاستدان، تھیٹر ڈائریکٹر، نقاد اور سائنس دان بھی تھا۔ ان تمام صفات نے مل جل کر اسے عالمی ادب کی دیو قامت شخصیات کی صف میں لا کھڑا کیا۔ بین الاقوامی شہرت و مقبولیت میں وہ ہومر، شیکسپیئر اور ڈانٹے کا ہم پلہ نظر آتا ہے اور "فاؤسٹ" اس کا شاہکار ہے۔ اس کی غنائی شاعری، موضوع اور اسلوب کی بوقلمونی کا نادر نمونہ ہے۔ افسانوی ادب میں اس کے مختصر اور طویل ناول، نفسیاتی گہرائی اور انسانی جذبات و احساسات کی تفسیر کی ناقابل تقلید مثالیں ہیں۔ نوجوان ورتھر (Werther) کی "داستان غم" اور "ولہلم مائسٹر کی سرگزشت" (Wilhelm Meister) اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ڈرامائی ادب میں بھی اس کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ اپنے لازوال اور نادرہ روزگار ڈراموں میں اس نے، جہاں تاریخی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، وہیں اس نے نظم اور نثر، دونوں پیرائیہ اظہار کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ یورپی نشاۃ ثانیہ کی پیداوار، مختلف النوع، عظیم شخصیات کے تمام خصائص اس فرد واحد کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت نقاد، صحافی، مصور، تھیٹر منیجر، مدبر، ماہر تعلیم، فطری فلسفی اور سائنس دان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جرمن زبان میں اس کی ساٹھ جلدوں پر مشتمل کلیات میں چودہ جلدیں، صرف اس کی سائنسی تحریروں کے لیے وقف ہیں۔ جرمن قوم کی اس سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اس کے قلم یا زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ نظموں، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ اس

کے خطوط، روزنامچے اور مکالمے تک اس کے عشاق کے حرز جاں ہیں۔ اپنی بیاسی سالہ زندگی میں اس نے دنیا بھر کے علم و حکمت کو اپنی ذات میں اس طرح جذب کیا کہ وہ ایک مافوق الفطرت ہستی کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ دانش و دانائی کا مجسمہ ہونے کے باوجود وہ زندگی کی آخری سانسوں تک گوشت پوست کا ایک ایسا انسان بنا رہا جس پر محبت اور غم کے جذبات اپنی پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے رہے۔ نپولین بوناپارٹ تو اس کو دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں بول اٹھا کہ "بے شک یہ ایک انسان ہے۔"

دراصل بقول نٹشے "اس کے سینے میں دو روحیں تھیں۔ ایک تو شاعر کی حسن پرست، عشق پرور، شورش انگیز، ہنگامہ خیز روح ـــــ اور دوسری، حکیم کی عرفان جو، حق پسند، سکون طالب، نظم آفریں روح۔ اس کو وہ ایک جگہ اپنی طویل، لافانی، ڈرامائی نظم "فاؤسٹ" میں اپنے ہیرو کی زبان سے یوں ادا کرتا ہے:

> • "میرے سینے میں دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں بڑی کشمکش ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور دونوں ایک دوسرے کے پنجے سے آزاد ہونے کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ایک نے جسمانی لذتوں کے شوق میں دنیاوی کثافتوں پر اپنا بدصورت جال پھیلا رکھا ہے اور دوسری، اپنی جبلی طاقت کے زور سے اُڑ کر آسمانوں کی طرف جانا چاہتی ہے، جو اس کا پیدائشی اور آبائی مسکن ہے۔" یہ دو روحیں بقول ڈاکٹر ریاض الحسن "گویا نیکی اور بدی کی حامل ہیں اور ان کی کشمکش سے گوئٹے کی زندگی میں جو توازن پیدا ہو گیا تھا، وہی انسانیت کا وہ اعلیٰ جوہر ہے، جو اس کو دوسری نامور ہستیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جرمنی نژاد تھا لیکن وہ اپنے کو. انسانیت اور تہذیب کا بجا طور پر نمائندہ سمجھتا تھا۔"

گوئٹے (جس کا پورا نام یوحان وولف گانگ فان گوئٹے تھا) 28 اگست 1749ء کو جرمنی میں دریائے رہائین کے کنارے آباد شہر فرانکفورٹ (Frankfurt) میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ اس کا والد، یوحان کیسپر گوئٹے (Johann Kaspar Goethe) اپنے بیٹے کی پیدائش کے وقت ایک ریٹائرڈ وکیل کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اتنی دولت جمع کر

لی تھی کہ وہ اپنی آئندہ زندگی، باوقار اور مہذب طریقے سے گزار سکے۔ وہ اٹلی کی سیر بھی کر چکا تھا اور اس نے اپنے آراستہ و پیراستہ گھر میں دنیا بھر کی بہترین کتابوں اور نادر تصویروں کا ذخیرہ کر رکھا تھا، جو نہ صرف اس کے بلکہ بعد ازاں اس کے نامور اور ذہین بیٹے گوئٹے کے کام آئیں۔ گوئٹے کی ماں بھی علم و فن بالخصوص موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ اس کا نام Katharine Elisabeth Textor تھا اور وہ اپنی اعلیٰ اخلاقی صفات، خصوصاً انسانیت پرستی کی وجہ سے اپنے بیٹے کے لیے ہمیشہ نمونہ عمل بنی رہی۔ گوئٹے کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہوئی چنانچہ اس نے گھر میں رہ کر ہی یورپ کی جدید و قدیم زبانوں کے علاوہ مذہب اور سائنس، تاریخ و جغرافیہ، ادب و شاعری، فنون لطیفہ، فن سپہ گری اور فن شہ سواری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد 1765ء میں باپ کی خواہش پر گوئٹے کو سولہ سال کی عمر میں قانون پڑھنے کے لیے اس کی پسندیدہ لائپزگ (Leipzig) یونیورسٹی میں داخل ہونا پڑا۔ یہاں اس نے قانون کے علاوہ ادب اور فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ وہ تین سال تک یہاں رہا لیکن خرابی صحت کی بنا پر گھر واپس آ گیا اور جب علاج کروا کر صحت یاب ہوا تو سٹراس برگ (Stras Bourg) یونیورسٹی میں داخل ہو گیا جہاں سے اس نے قانون کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران اس نے علم طب، علم کیمیا اور علم برق بھی پڑھنا شروع کیا۔ سٹراس برگ کے دوران قیام میں وہ ایک نوجوان نقاد ہرڈر (Herder) سے ملا جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ ہرڈر نے ہی گوئٹے کو بتایا کہ شاعری کا مقصد، محض تفریح طبع نہیں ہے بلکہ اس کا کام، قوموں کو ابھارنا اور ان کو ایک بلند اخلاقی اور عملی سطح پر لانا ہے۔ جرمن ادب کی تاریخ میں ہرڈر، ایک نئے طرز خیال کا بانی مانا جاتا ہے اور اس کی بلند پایہ تصانیف کے اثرات نہ صرف اس کے معاصرین بلکہ متاخرین پر بھی گہرے ہیں۔ ہرڈر کے فیضان صحبت سے ہی گوئٹے، فرانسیسیوں کی تقلید چھوڑ کر، جرمن طرز فکر کا پرستار بنا اور خود اپنے تمدن اور اپنی روح کی گہرائیوں میں اپنے جلیل مقاصد کی تلاش کرنے لگا۔ ہرڈر، گوئٹے اور ان کے ہم خیال ادیبوں کی تخلیقات نے جرمن ادب میں وہ انقلابی تحریک برپا کی جو تحریک ''طوفان و ہیجان'' (Storm and Stress) کے نام سے مشہور ہے۔

گوئٹے نے گو قانون کی ڈگری حاصل کر لی تھی لیکن وکالت کے پیشے میں اس کا دل نہ لگا، چنانچہ جلد ہی وہ تھیٹر کی طرف مائل ہوا اور اس نے کئی ڈرامے لکھ کر انہیں سٹیج کیا۔ اپنے تاریخی

ڈرامے "Goetz" اور چونکا دینے والے رومانی المیہ ناول ''ورتھر'' کی تخلیق کے ساتھ ہی اس نے جرمن ادب میں اپنا مقام بنالیا اور وہ نوجوان انقلابی ادیبوں کا رہنما بن گیا۔ اسی زمانے میں اس نے غنائیہ شاعری بھی بہت اعلیٰ سطح پر تخلیق کی اور رومانی شاعری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

1775ء میں گوئٹے کو ویمر (Weirmar) کے والیٔ ریاست، کارل اگست (Karl August) نے اپنے ہاں بلایا اور اس کی مدبرانہ صلاحیتیں دیکھتے ہوئے اسے خزانہ، زراعت اور معدنیات کا وزیر بنا دیا۔ ویمر کے دوران قیام میں اس کی ملاقات Frau Von Stein سے ہوئی جس نے اسے اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنالیا اور گوئٹے کی اگلی بارہ برس کی تخلیقات کا یہ خاتون منبع و سرچشمہ بنی رہی۔ 1786ء میں گوئٹے کو اطالیہ جانے کا موقع ملا جہاں وہ دو سال تک مقیم رہا اور اس قیام نے بھی اس کی اگلی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے۔ واپسی پر وہ پھر ریاستی تھیٹر سے وابستہ ہو گیا اور آئندہ 20 برس تک وہ نہ صرف ڈرامے خود لکھتا رہا بلکہ انہیں سٹیج بھی کرواتا رہا۔ اس کے مشہور کلاسیکی ڈرامے "Iphigenie" اور "Tasso" اسی دور کی یادگار ہیں۔ شلر (Schiller) دوسری بڑی ادبی شخصیت ہے جس کے ساتھ نوسالہ دوستی نے گوئٹے کی ادبی زندگی پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑے۔ گوئٹے کے عظیم "Ballads" اور ڈراما "Hermann and Dorthea" پر یہ اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

گوئٹے کا ''مغربی، مشرقی دیوان'' اور طویل نظم "Faust" کے دو حصے، اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے شاہکار ہیں۔ 22 مارچ 1823ء کو اپنی وفات سے پہلے وہ اپنی شہرۂ آفاق، طویل فلسفیانہ ڈرامائی نظم "Faust" مکمل کر چکا تھا جس کا مرکزی کردار ''فاؤسٹ'' ساٹھ برس تک مصنف کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اس نظم کے دو حصے ہیں اور پہلا حصہ، گوئٹے کی معجز بیانی اور فکری اڑان کا اوج کمال تصور کیا جاتا ہے۔ ضمیر اور محبت کی کشمکش اور جذبے اور دانش کے حسین امتزاج نے مصنف سے ایسا شاہکار تخلیق کروایا جس کی بدولت گوئٹے کو آج عالمی شعر و ادب کا سرتاج مانا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور محمود خالد

باب اول

مقدمہ

جرمن ادب گوئٹے سے قبل یورپ کی تمام بڑی قوموں میں جدید تمدنی زندگی کے اعتبار سے جرمن قوم سوائے روسیوں کے (اگران کا شمار یورپ کی قوموں میں کیا جائے) سب سے کم سن ہے۔ جب یورپ اسلامی تمدن اور یونا رومی تمدن سے متاثر ہو کر اس جمود سے چونکا جو اس پر قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں طاری تھا تو فرانس اور انگلستان میں سیاست و معیشت، علم و حکمت اور فنون لطیفہ غرض زندگی کے ہر شعبے میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ مگر جرمنی کی ترقی کا دور بہت دن کے بعد شروع ہوا۔ سولہویں صدی میں جو نئی زندگی کی لہر اطالیا سے اٹھی تھی وہ یہاں پہنچی مگر یہاں اسے عرصے تک ایسے گردابوں کا مقابلہ کرنا پڑا کہ اس کا سارا زور جاتا رہا۔ جرمنی میں عہد جدید مذہبی اصلاح سے شروع ہوا۔ مارٹن لوتھر نے پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد ڈال کر اپنے ہم قوموں کو رومی کلیسا کی مذہبی اور سیاسی غلامی سے نجات دلائی۔ اس کے سبب سے جرمنوں میں حرکت اور جوش کا ہیجان اٹھا مگر ملک کے بعض حصوں میں کیتھولک مذہب اس قدر مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ نئے مذہب کی شدید مخالفت ہوئی اور مذہبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس سے تمدنی ترقی رک گئی۔ سترہویں صدی کے آغاز میں ان لڑائیوں میں سویڈن اور فرانس نے مداخلت کی۔ سی سالہ جنگ نے جرمنی کو برباد کر دیا اور جرمن قوم کی روح کو ایسا کچلا کہ اسے نمٹنے میں کم و بیش 100 سال کا عرصہ لگ گیا۔ جرمنی کی علمی ترقی سترہویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی اور اس کے سیاسی استحکام کی ابتدا اٹھارویں صدی کے نصف اول میں اور تکمیل انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی۔ 1870ء میں جرمن ایک متحد قوم بن گئے۔

مستقل جرمن ادب اصل میں اٹھارویں صدی سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کی بنا سولہویں

صدی میں پڑ چکی تھی۔ اس سے قبل قرونِ وسطیٰ میں اور ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی علمی زبان لاطینی تھی۔ بولنے کی زبان بھی ایک نہ تھی بلکہ مختلف حصوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ ان زبانوں میں تصنیف وتالیف نہیں ہوتی تھی۔ تاہم شاعری جو بقول ہرڈر کے قوموں کی مادری زبان ہے موجود تھی۔ اس پر مذہبی رنگ چھایا ہوا تھا اور یہ کیتھولک عیسائیت کا رنگ تھا جو جرمن قوم کی طبیعت کے موافق نہ تھی۔ اس لیے اس زمانے کی جرمن مذہبی شاعری کچھ بے رنگ سی تھی۔ رزمیہ شاعری البتہ ان لوگوں کے مذاق کی چیز تھی۔ پرانی قومی داستانیں جوز اگاز (Sagas) کہلاتی تھیں نظم کی جاتی تھیں اور بہت ہر دل عزیز تھیں۔ ان میں نیبلنگن (Nieblungen) کی داستان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ "زیگفریڈ" کے کارناموں کا گیت ہے جو قدیم جرمنی کا ہیرو تھا جیسے رستم قدیم ایران کا۔ زیگفریڈ ایک سیدھا سچا بھولا بھالا سورما تھا۔ جنگجوی نے اس کے مزاج میں خشونت نہیں پیدا کی تھی۔ اس کا قلب رقت اور درد سے معمور تھا۔ وہ موسیقی کا شیدا تھا اور گھریلو زندگی کا عاشق۔ یہ جرمن قوم کا کیرکٹر ہے اور زیگفرڈ جرمن روح کی مثال۔ سولہویں صدی کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اثر سے "اطالیہ"، انگلستان، فرانس میں لوگ تنگ مذہبی دائرے سے باہر نکلے اور قدیم روم و یونان کی تقلید میں علم وحکمت وفنونِ لطیفہ کی طرف متوجہ ہوئے مگر جرمنی میں یہ تحریک صرف اس حد تک پہنچی کہ بعض لوگ یونانی اور لاطینی ادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ یونان و روم کی روح جرمنی کی تمدنی زندگی میں سرایت نہ کر سکی۔ یہاں نشانہ ثانیہ سے پہلے تجدید مذہب کا دور گزرا جس کا آغاز مارٹن لوتھر (1483 تا 1546) سے ہوا۔ لوتھر اصل میں جدید جرمن تہذیب و تمدن کا بانی ہے۔ اس نے نہ صرف اس مذہب کی بنا ڈالی جو جرمنوں کی گہری مذہبیت کا مظہر ہے بلکہ جرمن زبان اور ادب کی داغ بیل بھی اسی کے ہاتھ سے پڑی۔ اس نے انجیل کا اپنے وطن سیکسنی کی زبان میں ترجمہ کیا اور بہت سے مذہبی اور مناظرانہ رسائل لکھے۔ اس کے ترجمہ انجیل کی سادی اور ستھری زبان تمام جرمنی کی مشترکہ زبان بن گئی۔ اس نے ایک طرف پادریوں اور دوسری طرف لاطینی کے پرستاروں کے مقابلے میں جرمن زبان کی حمایت کی اور اسے ادبی زبان بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس زمانے میں چھاپا نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ لوتھر نے مطبوعہ کتابوں کو رواج دیا اور ان کے ذریعے سے اس کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ زبان کی بھی اشاعت ہوتی رہی۔ اس کی گہری نظر نے دیکھ لیا تھا کہ جو چیز مقبولِ عام نہ ہو سکے وہ قومی ترقی کے لیے زیادہ مفید نہیں۔

جس اصول کو پیش نظر رکھ کر اس نے انجیل کا ترجمہ کیا تھا اسے وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے جن سے اس کی اصابت رائے اس کی قومی محبت اور اس کے اکھڑ پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''ان گدھوں کی طرح لاطینی صرف ونحو سے نہ پوچھنا چاہیے کہ جرمن زبان کیوں کر بولی جائے بلکہ گھر میں بیٹھنے والی ماؤں سے سڑک پر کھیلنے والے بچوں سے بازار میں پھرنے والے لوگوں سے ان کی بات چیت کان لگا کر سنو اور اسی زبان میں ترجمہ کرو۔ تب وہ سمجھیں گے کہ تم جرمن زبان بول رہے ہو۔''

لوتھر کے مددگاروں میں الرش (Ulrich von Huetten) (1488ء تا 1523ء) خاص امتیاز رکھتا ہے۔ وہ ابتدا میں ہومینزم کی تحریک کا موید تھا اور لاطینی زبان کا شیدا مگر لوتھر کے اثر سے اس کے خیالات بدلے اور وہ نہایت جوش وخروش سے مذہبی اصلاح اور جرمن قوم کی سیاسی اور ذہنی آزادی کا حامی بن گیا۔ اس کی طبیعت میں لوتھر سے زیادہ شورش تھی چنانچہ اس نے اپنے زمانے کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کی ادبی خدمات بھی کم نہیں۔ آج تک اس کے قومی گیت فدائے ملت جرمنوں کے دلوں کو ابھارتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ملک کے سیاسی انتشار نے اس عہد میں جرمن ادب کی اٹھتی جوانی کو برباد کر دیا۔ تجدید مذہب نے جو نئی روح پھونکی تھی وہ بجائے اس کے کہ عام تمدنی اور ادبی ترقی میں صرف ہوتی خانہ جنگیوں کی نذر ہو گئی۔ سولھویں صدی کی ادبی پیداوار سوائے مذہبی گیتوں یا پوپ کیخلاف طنزیہ نظموں اور ڈراموں کے اور کچھ نہیں۔ ہانس زاکس نے ڈرامہ کو وسعت دینا چاہی اور ''وکرام'' نے ناول کی بناڈالی' لیکن عام ذہنی معیار اس قدر پست تھا کہ یہ دونوں چیزیں ترقی نہ کر سکیں۔ جرمن قوم کے گہرے دلی جذبات اس زمانے میں ادب العوام (Folklore) میں ظاہر ہوئے جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر اولکن سپیگل کے قصے اور فاؤسٹ کی داستان ہے جو گوئٹے کے ڈرامہ کا ماخذ ہے۔

سترہویں صدی کی ابتدا میں جرمنی میں ادبی تحریک کچھ دن کے لیے پھر ابھری۔ اس زمانے میں ملک میں مقابلتاً امن تھا اور لوگوں کو اتنی فرصت تھی کہ ذہنی زندگی کے مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ جرمنوں کو یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کا ادب دوسری قوموں کے ادب سے بہت پیچھے ہے اور انہوں نے اپنے دامن سے اس دھبے کو دور کرنے کی کوشش شروع کی۔ مارٹن اوپتز (1597ء تا

1639ء) نے جرمن زبان کی اصلاح و ترقی میں بہت سعی کی اور اس کے ساتھیوں نے بھی زبان کو بہت سنوارا۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے ان لوگوں کی تصانیف بالکل کھوکھلی ہیں۔ ان کے مضامین کا ماخذ یونانی اور لاطینی کے پرستاروں کی تصانیف ہیں اور یہ بھی ان لوگوں کی طرح یونان و روما کی نقالی کرتے تھے۔ اینڈریاس گریفیس اس عہد کا ممتاز ڈرامہ نگار تھا مگر اس کی تمثیلیں ڈرامہ کی روح سے خالی ہیں۔ اس عہد کی شاعری بالکل سطحی اور تصنع سے معمور ہے۔

جرمنی کو امن وسکون کا جو دور نصیب ہوا وہ دیرپا نہ تھا۔ تھوڑے ہی دن میں سی سالہ جنگ (1618ء تا 1648) شروع ہو گئی جس نے ملک کو مادی اور ذہنی حیثیت سے برباد کر دیا۔ اس جنگ میں فرانس جرمنی کی سیاست میں دخیل ہو گیا اور فرانسیسی تہذیب کا رنگ جرمن زندگی پر چھا گیا۔ فرانسیسی زبان جرمنی کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی۔ ذہنی غلامی کے زمانے میں کوئی قوم پوری ادبی ترقی نہیں کر سکتی۔ جرمنی کی ادبی تحریک جو اس صدی کے شروع میں اٹھی تھی بالکل فنا ہو گئی اور صدی کے آخر تک سوائے گریمیل باؤزن کے کوئی معقول ادیب نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سب سے مشہور ناول ایک آوارہ گرد کی خودنوشتہ سوانح عمری کے طور پر شائع ہوا جس کا نام Simplicissimus ہے۔

غرض سترہویں صدی کا جرمن ادب مجموعی حیثیت سے سولہویں صدی کے ادب سے بھی بہت پست تھا۔ اس پر تنگ خیالی، بدمذاقی اور کورانہ تقلید کا رنگ غالب تھا۔ نہ اس میں تخیل کی بلند پروازی تھی اور نہ تناسب اور ترتیب۔

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں جرمنی کی ذہنی حالت کچھ بہتر نظر آتی ہے۔ اب جرمن فرانسیسیوں کی تقلید میں بہت کچھ ترقی کر چکے تھے۔ اب وہ محض نقالی نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر تقلید کرتے تھے۔ فرانس اور انگلستان کا 'عقلی فلسفہ' جرمنی میں پھیل چکا تھا۔ اس فلسفے کا اصل اصول یہ تھا کہ ذہن انسانی کا اصل جوہر عقل ہے اور کائنات پر اسی کی حکومت ہے۔ انسان کی مادی ذہنی اور روحانی زندگی کا معیار عقل ہی کو قرار دینا چاہیے۔ جو چیزیں احساس و وجدان پر منحصر ہیں مثلاً مذہب یا آرٹ وہ بھی اسی حد تک قابل قبول ہیں جس حد تک وہ عقل کے مطابق ہوں۔ چونکہ عقل سب انسانوں میں مشترک اور ہر زمانے میں موجود ہے اس لیے صحیح علم، مذہب اور آرٹ کے اصول بھی ہر قوم کے لیے ہر عہد میں یکساں ہیں۔ آرٹ میں یہ اصول یونانیوں کو معلوم تھے اس لیے ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں یونانیوں کی تقلید اوج کمال پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

اس علمی تحریک کے ماتحت ایک تعلیمی تحریک بھی تھی۔اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ خیالات عوام میں پھیلیں اوران کے دل سے مذہبی تعصبات اور ہر طرح کی ضعیف الاعتقادی دور ہو۔جرمنی کی ذہنی تاریخ میں یہ تحریک Aufklaerung کہلاتی ہے اور ہم اسے نئی روشنی کی تحریک کہہ سکتے ہیں۔جرمنی میں اس کا ہراول' کرسٹیان ٹومس (1655ء تا 1728ء) ہے۔

عقلی فلسفے کا اس زمانے کے ادب پر بہت گہرا اثر پڑا۔اس زمانے کی تصانیف میں مذہبی شکوک عام طور پر نظر آتے ہیں۔شاعری اور ڈراما وغیرہ میں فرانسیسیوں کے توسط سے یونانی نمونوں کی پابندی ہونے لگی۔شاعری کے موضوع کو بہت وسعت ہوئی۔سچی شاعری کی جان انسانی جذبات کی ترجمانی کے علاوہ مناظر قدرت کی نقاشی ہے۔اب تک 'جرمن' شاعری میں حسن فطرت کی تصویروں کی کمی تھی۔براکس (1680ء تا 1774ء) نے اس کمی کو پورا کیا۔اس کی شاعری کا پایہ بہت بلند نہیں مگر اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے تخیل کی جولانی کے لیے ایک نئی راہ کھول دی۔

اس عہد کا سب سے بڑا ادبی نقاد' گوش شیڈ (1680ء 1747ء) ہے۔یہ لائپزش کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔'گوٹ شیڈ' عقلیت کا حامی تھا اور ادب میں یونانیوں کے مقرر کیے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابندی پر زور دیتا تھا۔سوئٹزرلینڈ' کا بوڈمر اس کا مخالف تھا اور لوگوں کو انگلستان کے ادب کی تقلید اور جذبات پرستانہ شاعری کی طرف توجہ دلاتا تھا۔ان دونوں کے پیروؤں میں سخت مناظرے رہتے تھے جن کی بدولت جرمنوں کے تنقیدی ذوق کو نشوونما کا بہت اچھا موقع ملا۔اسی زمانے میں لائپزش میں نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ تھا جو شاعری کا مقصد قوم کی اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا۔یہ لوگ 'بریمن' کے ایک رسالے میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ان لوگوں میں جرمنی کا پہلا بڑا شاعر کلوپٹ اشٹوک بھی تھا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف ثانی میں جرمن ادب نے یکا یک حیرت انگیز ترقی کی۔ 1740ء تک یورپ میں جرمن ادب کی کوئی وقعت نہ تھی اور 1800ء میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ کسی ملک کا ادب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔اس کایا پلٹ کا راز جرمنی کی سیاسی ترقی میں مضمر ہے۔اس زمانے میں ریاست بروشن[1] میں فریڈرک اعظم نے ایک مستحکم سلطنت قائم کی اور تمام یورپ میں

---

1. German, Preussen. English Prussia

اس کا فوجی اقتدار مسلم ہو گیا۔ دوسری بڑی بات یہ تھی کہ پروشن کو چھوڑ کر اور ریاستوں کو تجدید مذہب کے بعد پہلی بار ایک طویل عرصے تک چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ اب جرمنوں کے دل میں اپنی عزت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے اوپر اعتماد کرنے لگے اور اپنی زندگی کو اس قابل سمجھنے لگے کہ ادب اور شاعری کا موضوع بن سکے۔ یہ تحریک شروع ہوئی کہ فرانسیسیوں کی تقلید ترک کر دی جائے مگر یہ رنگ اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ یکایک اس کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ادب کے میدان میں اتنا ضرور ہوا کہ کلوپف اشٹوک، ویلانڈ اور لیسنگ کی بدولت جرمن شاعری ڈرامہ ناول وغیرہ میں مضامین کے اعتبار سے جدت، گہرائی اور بلند پروازی پیدا ہوئی اور اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کا واسطہ چھوڑ کر براہ راست یونانیوں کی تقلید ہونے لگی اور یونانیوں کے مقرر کیے ہوئے قواعد وضوابط کی تفسیر جرمن ادیب اپنے طور پر کرنے لگے۔

کلوپف اشٹوک (1724ء تا 1803ء) جیسا ہم کہہ چکے ہیں لائپزش کے اس حلقے میں سے تھا جو شاعری کا مقصد اخلاقی اصلاح کو سمجھتا تھا۔ اس نے جرمن شاعری کا پایہ بہت بلند کر دیا۔ شاعری اب محض ادبی مشق یا عارضی تفریح کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ گہرے مذہبی اور اخلاقی جذبات کا آئینہ بن گئی۔ کلوپف اشٹوک کی سب سے مشہور تصنیف ''مسیحا'' ہے جس میں اس نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا قصہ نظم کیا ہے۔ اس میں اس نے مسیح کے حالات بالکل کلیسائی روایات کے مطابق بیان کیے ہیں۔ اس لیے زیادہ شاعری کا موقع نہیں ملا۔ اس کے کیرکٹر جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ کٹھ پتلیاں ہیں جن کی زبان سے شاعر بولتا ہے۔ یہی حال اس کے ڈراموں کا ہے جن کے موضوع انجیل کے قصے میں اس کی غنائی شاعری ترنم سے خالی ہے۔ البتہ قومیت کے جذبے کی بدولت اس کی شاعری میں کہیں کہیں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے بڑا نقص اس کی شاعری کا یہ ہے کہ اس کا فطرت انسانی کا تصور بالکل یکطرفہ ہے۔ وہ انسان کو محض جذبات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کی ارادی اور عملی زندگی اور اس کی شہوانی کمزوریوں کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے۔

ویلانڈ (1733ء تا 1713ء) کے کلام کی خصوصیت اس کا سادہ اور مؤثر اسلوب بیان ہے۔ موضوع کلام اور خیالات کا اعتبار سے اس کی شاعری کے دو علیحدہ دور ہیں۔ پہلا مذہبیت اور تصوریت کا ہے۔ اس زمانے میں اس نے ایک طویل نظم ''حقیقت اشیاء'' کے نام سے لکھی۔ اس

میں اس نے قدیم فلسفی شاعر لکریشیس کی مادیت کے خلاف افلاطون کی تصوریت کی حمایت کی۔ اسی دور میں اس نے ''بہار'' کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں افلاطونی عشق کی حقیقت بیان کی گئی تھی۔ ''ابراہیم کا امتحان'' میں چند منظوم خطوط ہیں جن میں کچھ مردے اپنے زندہ دوستوں سے وہ روحانی واردات بیان کرتے ہیں جو انہیں مرنے کے بعد پیش آئی۔ ویلانڈ کی اس دور کی شاعری میں اصلیت کم اور تصنع زیادہ ہے جو مذہبی اور اخلاقی مطالب بیان کیے گئے ہیں وہ دل سے نکلے ہوئے جذبات نہیں بلکہ دماغ سے پیدا کیے ہوئے خیالات ہیں۔

اس کی شاعری کا دور سا دور وہ ہے جب والیٹر اور شیکسپیئر کی تصانیف کے مطالعے اور زندگی کا وسیع تصور قائم ہوا۔ اب اس نے جتنی چیزیں لکھیں ان سب کا موضوع اپنے زمانے کے مسائل زندگی کو قرار دیا۔ افسانے سب غیر ملکوں کے ہیں لیکن ان کے پردے میں وہ اپنے ملک کی حالت دکھاتا ہے۔ مثلاً ''ڈان سلویو'' جو ڈان 'کیہوٹے' کی طرح اسپین کے ایک بانکے کا قصہ ہے۔ ''اگاتھون'' جس میں ایک یونانی سورما کے حالات ہیں۔ ''طلائی آئینہ'' جو الف لیلیٰ کے قسم کی کتاب ہے اور مشرقی ممالک کے قصوں کا مجموعہ۔ جو زور بیان کلوپٹ اشٹوک کے یہاں تھا اس سے ویلانڈ کا کلام خالی ہے۔ اسی لیے اسے جتنی مقبولیت غیر ممالک میں حاصل ہوئی خود جرمنی میں نہیں ہوئی۔ یہاں ایک گروہ اس کا مخالف تھا جو اس کی واقعیت پسندانہ شاعری کو مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔

اس دور کا سب سے بڑا ادیب نقاد اور ڈرامہ نگار 'لیسنگ' (1729ء تا 1781ء) ہے۔ اس نے اس طرز شاعری کو جو کلاسیکی کہلاتا ہے کمال کو پہنچا دیا۔ اس طرز کی خصوصیات یہ ہیں کہ انداز بیان سادہ اور حقیقت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اصول فن کی پوری پابندی کی جاتی ہے اور جذبات کو عقل کے ماتحت رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خیالات کے اعتبار سے لیسنگ ''عقلیت'' اور ''نئی روشنی'' کا علم بردار ہے۔ رسم و کیش، مذہب و ملت کی قیود کو وہ عقل انسانی کے لیے زنجیریں سمجھتا ہے۔ وہ ان پردوں کے پیچھے انسانیت کے عین کو دیکھتا ہے اور اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔

اس کے ابتدائی ڈراموں میں اصول فن کے لحاظ سے فرانسیسیوں کی تقلید ہے لیکن چونکہ وہ ناقدانہ طبیعت رکھتا تھا اس لیے اس نے خود یونانی ڈراموں کا جن کی تقلید کا فرانسیسیوں کو دعویٰ تھا نظر غور سے مطالعہ کیا اور اس کی بنا پر ڈرامہ نویسی اور دوسرے فنون لطیفہ کے اصول و ضوابط قائم

کیے۔ فن تنقید میں اس کی دو کتابیں 'ہامبرگ کا فن ڈرامہ' اور 'لو کوآن' مشہور ہیں۔ اس کی تنقید عقلیت کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک فنون لطیفہ کا عام معیار خوبی یہ ہے کہ وہ صاف اور واضح تصورات کو منطقی تناسب اور ترتیب سے پیش کریں۔ اس کا پہلا اور بجنل ڈرامہ ''سارہ سیمپسن'' ہے۔ اس میں اس نے یہ قدیم اصول توڑ دیا کہ المیہ کا موضوع ہمیشہ بادشاہوں یا امراء کی زندگی ہونا چاہیے اور ایک معمولی خاندان کی لڑکی کا قصہ بیان کیا لیکن اس افسانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ ''مینا فان بان رن ہیلم'' اپنے موضوع کے لحاظ سے نیز ڈرامہ کی خصوصیات کے اعتبار سے نہایت کامیاب کامیڈی ہے۔ اس میں جذبہ عشق کی کشمکش احساس فرض اور حب وطن سے دکھائی گئی ہے۔ اس ڈرامے میں ایک فرانسیسی کا مضحک کیرکٹر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں کے دل پر فرانسیسیوں کا اب وہ پہلا سا رعب نہیں رہا تھا۔

لیسنگ کے دو ڈرامے ''ایمیلیا گیلوٹی'' اور ''دانشمند ناتان'' ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ ایمیلیا میں لیسنگ نے اپنے عہد کی اطالوی زندگی ک ایک المناک قصہ لکھا ہے جو اس کے ادبی طرز کی بہترین مثال ہے۔ ناتان سلطان صلاح الدین کے زمانے کی صلیبی جنگ کا افسانہ ہے جس میں ایک یہودی حکیم کی زبان سے مذہبی رواداری کا درس دیا گیا ہے اور عقلیت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

غرض اٹھارہویں صدی میں جرمن زبان بہت منجھی اور صاف ہوئی اور جرمن ادب فرانسیسیوں کی تنقید سے آزاد ہو گیا۔ اس میں جدت اور وسعت پیدا ہوئی لیکن ابھی گہرائی نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ اس صدی میں جس راہ پر جرمن ذہن چل رہا تھا یعنی عقلیت کا فلسفہ اور کلاسیکی ادب وہ جرمن قومی طبیعت کے مناسب نہ تھا۔ اس قومی طبیعت میں باطنیت اور انفرادیت ہے اس کے تخیل میں شورش ہے، وہ خارجی قیود سے گھبراتی ہے اور لاعقلی عناصر کو عقل کے ماتحت نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس کی تربیت اور انضباط کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ عقلیت کے دور سے گزرے لیکن وہ زیادہ دن تک اس کی پابند نہیں رہ سکتی تھی۔ فلسفے میں ''کانٹ'' کے ناقدانہ دماغ نے عقلیت کی حدود معین کر دی تھیں۔ اس کے بعد تصوریت پسند فلسفیوں کو تخیل کی بلند پروازی دکھانے اور لاعقلی عناصر پر زور دینے کا موقع ملا۔ ادبی تنقید میں عقلیت کے خلاف علم پیکار بلند کرنے والا عالم دین 'ہرڈر' تھا۔ عقلیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ذہن انسانی کو ساکن اور یک رنگ سمجھتی تھی

اور اس کی تاریخی نشو ونما اور رنگارنگی کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ اُس کے نزدیک انسانی زندگی اور خیال کے اصول جو عقل کی روشنی میں صحیح ہوں ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے یکساں ہیں۔ ہرڈر نے اس پر سختی سے تنقید کی اور تاریخی منہاج کی بنا ڈالی۔ اس کی کتاب جمالیات میں جو تنقیدی اصول بیان کیے گئے وہ بالکل نئے اور اچھوتے تھے۔ اس کے نزدیک ہر قوم کا ادب اور اس کی شاعری قومی سیرت کی خصوصیات کا آئنہ اور قومی زندگی کی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک سچی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی خواہشات و جذبات کی تصویر ہو اور شدت احساس اور خلوص سے لبریز ہو۔ اگر یہ باتیں شاعری میں موجود ہوں تو وہ فطری شاعری ہے ورنہ ایک مصنوعی اور بے جان چیز ہے۔ اس معیار پر اس کے خیال میں وہ گیت پورے اترتے ہیں جو عوام کے بنائے ہوئے اور ان میں مقبول ہوں۔ اس لیے یہی سچی شاعری کا نمونہ ہیں۔ اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ ''شاعری نوع انسانی کی مادری زبان ہے۔'' اس نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ مختلف قوموں کے منتخب گیتوں کا تیار کیا اور اس کا نام ''قوموں کی آواز گیت کے پردے میں'' رکھا۔

''جرمن ادب کے متعلق چند متفرق خیالات ہرڈر کا شاہکار ہیں۔ اس میں اس نے اپنا فلسفہ لسان بیان کیا ہے۔ ہرڈر کہتا ہے کہ ہر قوم کی زبان میں ایک خاص روح ہوتی ہے اور یہی روح اس کے ادب کے لیے وجہ حیات ہے۔ زبان کے ارتقا کے عام اصول قائم کرنے کے بعد وہ جرمن زبان کی خصوصیات بتاتا ہے اور اس کی نشو ونما دکھاتا ہے۔ اس کے نزدیک ''نئی روشنی'' کے دور نے جرمن زبان و ادب کو ابھرنے نہ دیا۔ اس عہد میں ذہن انسانی کی ساری کائنات عقل سمجھی جاتی تھی حالانکہ عقل اس کا محض ایک پہلو ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے کافی نہیں۔ ''تنقید کے جنگل'' میں اس نے ان خیالات کو پھیلایا ہے اور ان سے ادبی تنقید میں کام لیا ہے۔

''اوسیاں کے متعلق خطوط'' میں اس نے ایک قدیم کیلٹ کے کلام پر تبصرہ کیا اور اسے یونان کے مایہ ناز شاعر 'ہومر'' کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ مقالہ بر کلام شیکسپیئر میں اس نے یہ بتایا کہ شیکسپیئر کی تصانیف کو فرانسیسی تنقیدی اصول پر نہ جانچنا چاہیے بلکہ انگلستان کی مخصوص ادبی روح کے معیار پر۔

اس کی ایک نہایت اہم کتاب ''Auch eine Philophie der Geschichte'' ہے۔ اس عنوان کا ترجمہ اردو میں یہ ہوگا۔ ''تاریخ کا بھی فلسفہ ہے۔'' اس نے تاریخ کے مطالعے میں روحانی ارتقا کے نظریے سے کام لیا اور قرون وسطی کے متعلق عام مؤرخین کا جو حقارت آمیز

رویہ تھا اس کی سختی سے مخالفت کی۔ لوگ اس عہد کو تاریکی کا زمانہ سمجھتے تھے۔ ہرڈر نے یہ ثابت کیا کہ اس زمانے میں یورپ میں ایک مکمل نظام زندگی موجود تھا جو فطرت سے قریب تر تھا۔

ہرڈر کا طرز تحریر بھی خاص ہے وہ لکھنے میں کسی اصول کی پابندی نہیں کرتا اور اپنے خیالات وضاحت، صفائی اور روانی سے ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپ نہیں لیکن اس کے خیالات اس قدر گہرے تھے اور اس نے جرمن انداز طبیعت کو اس خوبی سے سمجھا تھا کہ اس کی وجہ سے جرمنی کی ادبی دنیا میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا۔ اس کی تحریک سے جرمن زبان بیرونی بندشوں کو توڑ کر آزاد ہوئی اور جرمن روح کی بے چینی، آرزو اور جستجو نے ادب اور شاعری میں عجب سوز و گداز پیدا کر دیا۔

اس ادبی انقلاب کی جو طوفان و ہیجان کا دور کہلاتا ہے، ابتدا اس زمانے سے سمجھنا چاہیے جب اسٹراسبرگ میں ہرڈر اور گوئٹے میں ملاقات ہوئی۔ (1771ء)۔ نوجوان گوئٹے جس قدر ہرڈر کی اثر آفریں شخصیت سے متاثر ہوا اپنے ہمعصروں میں کسی سے نہیں ہوا۔ 1772ء میں ایک مجموعہ مضامین ''جرمن ذہن اور جرمن آرٹ'' کے نام سے شائع ہوا جو گویا نئے دور کا پیش خیمہ تھا۔ اس میں ہرڈر، گوئٹے اور چند اور لوگوں کے مضامین تھے۔

اس ادبی انقلاب نے دو راہیں اختیار کیں ایک تو غنائی شاعری اور دوسرے ڈرامہ۔ نئی غنائی شاعری کا مرکز گوٹنگن تھا جہاں یونیورسٹی کے چند طالب علموں نے مل کر ایک حلقہ شعراء قائم کیا جن میں فوس اور بیورگر ممتاز تھے۔ یہ لوگ ایک سال نامہ ''آرٹ کی دیویوں کے سال نامے'' کے نام سے نکالتے تھے۔ ان کی شاعری نفس مضمون اور طرز ادا کے لحاظ سے کلاسیکی شاعری کی ضد ہے۔ ان کے کلام میں اس قدر جوش و خروش ہے کہ وہ پوری طرح اپنے مضمون پر قابو نہیں پا سکتے۔ ان کا موضوع کلام انسان کی داخلی زندگی، اس کے جذبات کا ہیجان، اس کی باطنی قلبی واردات ہے۔ اس ضمن میں گوئٹے کا 'ورتھر' بھی شمار کیا جا سکتا ہے جو شعر منثور کا نمونہ ہے۔

لیکن طوفان و ہیجان کی تحریک کا اصل زور ڈرامہ میں ظاہر ہوا۔ جرمنی کے دو سب سے بڑے ڈرامہ نگار ''گوئٹے'' اور ''شلر'' اپنی جوانی کے زمانے میں اس تحریک کے علم بردار تھے۔ گوئٹے کا گوتس اور شلر کا قزاق، ہیجان و طوفان کا آئینہ ہے۔ ''گوتس'' سولھویں صدی کے ایک بانکے سردار کا قصہ ہے اور ''قزاق'' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قزاقوں کا افسانہ ہے۔

دونوں میں مصنفوں کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو مروجہ اخلاق کو توڑ کر محض اپنے ضمیر کے احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ گوئٹے اور شلر نے اس دور میں اور بھی کئی ڈرامے لکھے اور یہ رنگ اس قدر پھیلا کہ بہت سے ڈرامہ نگاروں نے اسے اختیار کر لیا۔ ان لوگوں میں ''کلنگر'' کسی قدر اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے ڈرامہ ''طوفان و ہیجان'' کے نام سے یہ دور موسوم ہے۔

اس دور کی خصوصیات تین تھیں:۔ کلاسیکی اصول فن کی سختیوں سے آزادی، داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت مروجہ اخلاقی اور تمدنی قوانین کے خلاف احتجاج۔ اس زمانے میں جرمن روح کو اپنی خصوصیات اپنی خوبیاں اور کمزوریاں پوری طرح ظاہر کرنے کا موقع ملا۔

اس دور کی کمزوریاں بھی صاف نظر آتی ہیں۔ ادب اور زندگی کی صحیح نشوونما کے لیے جہاں بے جا قیود سے آزادی لازمی ہے وہاں کسی نہ کسی ذہنی معیار کی پابندی بھی ضروری ہے۔ ''طوفان و ہیجان'' نے جرمنی کی رومانی روح کو آزاد کر دیا تھا۔ اس میں بے حد زور، بے تھاہ گہرائی، بے پایا وسعت تھی، لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ ان خوبیوں کے ساتھ ترتیب اور ہم آہنگی کے نہ ہونے سے بے راہ روی اور انتشار کا خوف ہے۔ کچھ دن میں اس دور کے ادیبوں کی بے اصولی، داخلیت اور انفرادیت حد سے گزرنے لگی۔ اس کا احساس سب سے پہلے گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت کو ہوا۔ اس نے اس مسئلے کو اپنی زندگی اور اپنی تصانیف دونوں میں حل کیا۔ ایک طرف تو اس نے زندگی میں آزادی اور پابندی، فطری جوش اور اخلاقی انضباط Genius (خداداد تخلیقی قوت) اور Character (اکتسابی سیرت) میں امتزاج پیدا کر کے جرمن قوم کے لیے ایک نمونہ قائم کیا اور دوسری طرف اپنی شاعری میں رومانی روح کے ہیجان و طوفان کو کلاسیکی ہم آہنگی اور تربیت کی مدد سے راہ پر لگا دیا۔ گوئٹے کے بعد کئی بار جرمن روح کے دست وحشت نے زندگی کے گریبان تنگ کو چاک کیا لیکن گوئٹے کی زندگی اور شاعری کی مثال سامنے تھی۔ اس لیے فوراً ہی اس کی بخیہ گری بھی ہو گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ گوئٹے نے یہ مثال کیوں کر قائم کی۔

باب دوم

گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اس کی تصانیف

'یوحان وولف گانگ گوئٹے' 1749ء میں شہر فرانکفرٹ میں جو دریائے مائن کے کنارے واقع ہے، پیدا ہوا۔ اسے اپنے باپ سے ضبط وانضباط' باریک بینی اور مشاہدے کی عادت ورثے میں ملی اور اپنی ماں سے وسعت تخیل اور ذوق جمال۔ وہ اپنے ایک قطعے میں کہتا ہے۔

'اپنے باپ سے میں نے وجاہت اور سنجیدگی پائی ہے اور اپنی پیاری ماں سے زندہ دلی اور کہانی کہنے کا شوق۔'' جوانی میں اس کے مزاج میں بے حد تلون تھا۔ اس کا دل جذبات وکیفیات کا ایک سمندر تھا جس میں ہمیشہ مدوجزر رہتا تھا۔ کبھی ملال اور افسردگی کبھی جوش اور مسرت' کبھی حوصلہ مندی اور امید' کبھی بے دلی اور یاس' کبھی لطف صحبت کا ذوق' کبھی تنہائی کی تلاش۔ یہ کیفیت کم وبیش ہر نوجوان کی ہوتی ہے۔ عہد شباب میں جس طرح خون گرم ہوتا ہے اور تیزی سے بہتا ہے اسی طرح جذبات کے تلون اور بے چینی کو محض عمر کا تقاضا نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی یہ سیماب مزاجی عنفوان شباب کے گزرنے کے بعد بھی عرصے تک اسی زور وشور سے باقی رہی بلکہ آخر عمر میں بھی رہ رہ کر ظاہر ہوتی رہی۔ اس کے اس باطنی اضطراب کا سبب یہ تھا کہ اس کے سینے میں ''دو روحیں'' تھیں۔ ایک تو شاعر کی حسن پرست' عشق پرور' شورش انگیز' ہنگامہ خیز روح اور دوسرے حکیم کی عرفان جو حق پسند' سکون طلب' نظم آفریں روح۔ ان دونوں کی کشمکش اسے چین نہ لینے دیتی تھی اور اس کشمکش کو دور کرنے پر اس کی نجات منحصر تھی۔ اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں بلا کی وسعت اور ہمہ گیری اور اس کی طبیعت میں غضب کی آمد اور روانی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنی تخلیقی قوت کے لیے کیا حدود اور کیا ضوابط مقرر کرے تا کہ وہ سیلابی دریا کے مانند کناروں کو توڑ کر آس پاس کی بستیوں کو ویران نہ کردے بلکہ تنک روندی کی طرح ایک مقررہ

دھارے میں بہہ کر اپنی وادی کو سیراب کرے اور زرخیز بنائے۔ غرض گوئٹے کو اپنی ذات کی ارتقا اور تکمیل کے لیے ایک بہت بڑا کام انجام دینا تھا۔ یعنی اپنے مزاج کے متضاد عناصر میں توازن پیدا کرنا اور اپنے ذہن کی حد بندی تہذیب اور انضباط کرنا۔

مگر گوئٹے کا کام یہیں تک محدود نہ تھا۔ وہ شاعر تھا اور اس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اپنی داخلی زندگی کے نشیب و فراز اور نشو و نما کو الفاظ و تصورات کے خوش نما نقوش، لحن و صوت کی خوش آئند ترکیبوں میں ظاہر کرے تاکہ دوسرے بھی اس سے سرور کے پردے میں تسکین اور نجات حاصل کریں۔ جس روحانی کشمکش میں گوئٹے مبتلا تھا اسی میں اس کی قوم بھی گرفتار تھی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس زمانے میں رومانی جرمن روح، فرانسیسیوں اور یونانیوں کی تقلید سے آزاد ہو کر اپنی فطری جوش کی رو میں بہہ رہی تھی۔ جرمن ادب پر طوفان و ہیجان کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس نے اصول کے بند توڑ دیئے تھے اور مذہب و اخلاق رسم و رواج کے پشتوں کو کمزور کر دیا تھا لیکن ایک طرف تو کلاسیکی تاریخی روایات، دوسری طرف جرمنوں کی گہری مذہبیت، تیسری طرف فریڈرک اعظم کا قائم کیا ہوا فوجی انضباط جو تمام قوم کے دل میں گھر کر چکا تھا یہ سب قوتیں طوفان و ہیجان کی تخریبی اور انقلابی تحریک کی مطلق العنانی کو روک رہی تھیں۔ بہتوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ تخریب کے ساتھ تعمیر کی بھی ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ اس کا احساس گوئٹے کو تھا اور اسی میں اتنی قوت بھی تھی کہ اس طوفان کو قابو میں لا کر اس سے کشت زندگی کی آبیاری کا کام لے۔

غرض گوئٹے کی زندگی اس اصلاح و تعمیر کا افسانہ ہے جو اس نے اپنی سیرت میں اور اپنی قوم کے ادب اور تہذیب میں کی۔ یہ کوئی سہل کام نہ تھا جو تھوڑے دن میں انجام پا جاتا بلکہ اس میں گوئٹے کو سالہا سال داخلی اور خارجی مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھنا پڑے۔ اس کی زندگی کے چھ دور قرار دیئے جا سکتے ہیں جنہیں ہم علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے۔

پہلا دور بچپن اور عنفوان شباب کا ہے۔ فرانکفرٹ میں گوئٹے کی زندگی باپ کی سخت نگرانی میں، ماں کے دامن شفقت میں، بہن کے ساتھ پیار اور کھیل میں گزری۔ اس کا باپ خوشحال آدمی تھا مگر سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو بڑے اہتمام سے گھر پر تعلیم دیتا تھا۔ گوئٹے 10 برس کا تھا (1759ء) کہ فرانسیسیوں نے فرانکفرٹ پر قبضہ کر لیا اور شہر والوں کے گھروں میں جبراً فرانسیسی سپاہی اور افسر رکھے گئے۔ گوئٹے کے گھر میں بھی فرانسیسی افسر

رہتے تھے۔اس کا باپ شرم اور نفرت کے جذبات سے اس قدر مغلوب تھا کہ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا مگر خاندان کے اور سب افراد ان فرانسیسیوں کی خوش مزاجی، تہذیب اور نفاست سے بہت خوش تھے اور ان کے ساتھ لطف سے وقت گزارتے تھے۔اس طرح گوئٹے کے خیالات اور اس کے مذاق پر بچپن سے فرانسیسی اثر پڑا۔ 1765ء میں جب وہ لائپزش کی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم پانے کے لیے بھیجا گیا اس وقت وہ فرانسیسیوں کی تقلید میں سر سے پیر تک ڈوبا ہوا تھا۔اس کی وضع قطع میں بات چیت میں نشست برخاست میں تکلف اور تصنع کی بھرمار تھی۔لائپزش کے لوگوں پر بھی یہی رنگ چھایا ہوا تھا۔یہاں گوئٹے کی زندگی سخت روحانی کوفت میں گزری۔اس کی شاعرانہ طبیعت اپنے اور دوسروں کے اس طرز زندگی سے سخت بیزار تھی۔علاوہ اس کے کہ وہ یونیورسٹی کے تنگ نظرانہ اور سطحی طرز تعلیم سے بہت گھبراتا تھا۔ایک تو وہ خاموش اور حساس طبیعت رکھتا تھا اور ملنے جلنے سے پرہیز کرتا تھا اور دوسرے درسی مشقوں کو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سمجھ کر ان سے جی چراتا تھا۔اس لیے اس کے استادوں کو اس کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔طالب علموں میں بھی اس کے دوست بہت کم تھے۔اس کسمپرسی سے محبت کا بھوکا گوئٹے ہمیشہ ملول اور افسردہ رہا کرتا تھا۔کچھ اس کے اثر سے اور کچھ نوجوانی کی بے راہ روی سے وہ ایک معمولی درجے کی عورت اینٹے شوئنے کوپف پر عاشق ہوگیا۔اس زمانے میں اس نے بہت سے غنائی نظمیں لکھیں اور دو چھوٹے ڈرامے۔لیکن اس کلام میں بھی وہی تصنع پایا جاتا ہے جو اس کی زندگی میں تھا۔اس کو ابھی وہ راہ نہیں ملی تھی جسے اس کی روح ڈھونڈتی تھی۔اس کے حوصلے اس کی آرزو اس کے نصب العین میں اور اس کی واقعی زندگی میں جو تضاد تھا اس نے گوئٹے کو عجب روحانی کشمکش میں مبتلا کردیا تھا۔عشق کے معاملے میں بھی اسے تھوڑے دن کے بعد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اینٹے سے اس کے تعلقات نہ نبھ سکے۔ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوئٹے کی صحت روز بروز گرتی گئی یہاں تک کہ آخر وہ سخت بیمار ہوکر 1768ء میں اپنے گھر فرانکفرٹ واپس آیا۔

یہاں وہ ڈیڑھ سال تک علالت کی حالت میں رہا۔اس کی ماں کی دوست فرونلائن فان گلیٹنبرگ نے جو پیٹسٹ [1] فرقے سے تعلق رکھتی تھی بڑی دل سوزی سے اس کی تیمارداری کی۔وہ

---

1 (جرمنی میں ایک مذہبی فرقہ تھا جو سترہویں صدی میں قائم ہوا تھا۔یہ لوگ پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہائی عقلیت اور خشکی کو تصوف اور جذبات پرستی کی چاشنی سے دور کرنا چاہتے تھے۔)

چاہتی تھی کہ گوئٹے کو اپنے فرقے میں شامل کرلے۔ اس کی صحبت کے اثر سے گوئٹے کے دل میں مذہبیت کا جوش پیدا ہوا جو کسی نہ کسی صورت میں عمر بھر باقی رہا۔ مگر پیٹسٹ فرقے کے جذبات پرستانہ عقائد سے اس کی تسکین نہیں ہوئی۔ اس نے اس سلسلے میں سحر و نیز نجات کی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن اس کی ناقدانہ اور محققانہ نظر نے بہت جلد دیکھ لیا کہ ان چیزوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ پھر بھی فروکلائن فان کلیٹنبرگ کا وہ بہت ممنون احسان تھا اور اس نے اپنے ناول ولہیلم مالسٹر میں اس خاتون کی سیرت نہایت خوبی سے بیان کی ہے۔

گوئٹے کی زندگی کا دوسرا دور 1770ء سے شروع ہوتا ہے جب وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے اسٹراسبرگ گیا۔ یہ شہر فرانس کی سرحد پر واقع ہونے کے سبب سے لائپزش سے بھی زیادہ فرانسیسی رنگ میں رنگا ہوا تھا لیکن گوئٹے کی نظر میں اب زیادہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی۔ یہاں اس نے اپنے ہم وطنوں کو اس اندھے پن سے وضع قطع گفتگو اور خیالات میں فرانسیسیوں کی تقلید کرتے دیکھا تو اسے بے حد شرم آئی اور ان کی ضد پر اس نے دل میں جرمن قومی تمدن کی محبت کا جذبہ بیدار ہوا اور ہرڈر کی ملاقات گویا سونے پر سہاگا ہو گئی۔ ہرڈر نے گوئٹے کے دل میں قومیت کے جوش کو اور ابھارا، اسے اپنا قومی ادب کا نظریہ سمجھایا اور جرمن میں قومی شاعری اور جرمن طرز تعمیر کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گوئٹے پر ہرڈر کی شخصیت کا جتنا گہرا اثر پڑا اتنا کسی کا نہیں پڑا اور جتنی عقیدت اسے اس سے تھی اور کسی سے نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ ہرڈر گوئٹے کے ساتھ برابر بختی بے مروتی، ہمت شکنی، تضحیک کا برتاؤ کرتا رہا گوئٹے کے دل میں اس کے خیالات کا احترام رہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوئٹے نے فاؤسٹ میں شیطان کی جو تصویر کھینچی ہے وہ ہرڈر اور اس کے ایک اور دوست میرک کے خدوخال سے مرکب ہے۔ اسٹراسبرگ میں اور بھی کئی نوجوان ہرڈر کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے اور ان سب نے مل کر ایک ادبی حلقہ قائم کیا تھا جس نے جرمنی کی رومانی روح کو بیدار کرنے کے لیے طوفان و ہیجان کی تحریک شروع کی لیکن اس تحریک کا روح رواں گوئٹے ہی تھا۔ اسی کی بدولت رومانیت پروان چڑھی اور اسی نے اس کی کمزوریوں کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی۔

اسٹراسبرگ میں بھی گوئٹے کے درد آشنا دل نے محبت کی چوٹ کھائی۔ شہر کے قریب ایک خاندان رہتا تھا جس سے گوئٹے کی ملاقات تھی۔ صاحب خانہ کی بیٹی فریڈریکے بریون کے حسن

نے گوئٹے کے دل کو موہ لیا۔ محبت بالکل پاک تھی۔ اسی لیے گوئٹے پر اس کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنی معشوقہ کو ''فاؤسٹ'' میں گریٹشن بنا کر اسے حیات جاودانی بخش دی۔ کشمکش آرزو سے نجات پانے اور راز معشوق کی پردہ داری کے خیال سے گوئٹے نے اس گھر میں آنا جانا ترک کر دیا۔ یہ رمیدگی اس کے عشق کی خصوصیت تھی اور کئی بار مختلف موقعوں پر ظہور میں آئی۔

جب گوئٹے 1771ء میں اپنی تعلیم ختم کر کے اور قانون کی سند لے کر اسٹرابرگ سے رخصت ہوا تو اس کے دل میں دو ڈراموں کا منصوبہ تھا ایک تو ''گوتس فان برلی شنگن'' کا اور دوسرے ''فاؤسٹ'' کا۔ یہ دونوں سولہویں صدی کے جرمن کیرکٹر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرڈر کے اثر سے قومی ادب کا خیال گوئٹے کے دل میں کس قدر راسخ ہو چکا تھا۔

اب گوئٹے نے فرانکفرٹ میں وکالت شروع کی لیکن اس کا اصل مشغلہ تصنیف و تالیف تھا۔ 1771ء میں اس کا ڈرامہ ''گوتس'' شائع ہوا۔ یہ جرمن ادب میں اپنی قسم کا پہلا ڈرامہ تھا۔ اس میں سولہویں صدی کے ایک اولوالعزم بانکے کا قصہ ہے جو رسمی اخلاق کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے اخلاقی نصب العین کے ماتحت شجاعت اور مردانگی کے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ وہ شہنشاہ اور دوسرے رئیسوں سے لڑ کر اپنے طبقے کی کھوئی ہوئی عزت حاصل کرتا ہے اور میدان جنگ میں تلوار کا زخم کھا کر ہنستے کھیلتے جان دیتا ہے۔ اس منشور ڈرامے میں گوئٹے نے شیکسپیئر کی طرح تمام مسلمہ اصول فن توڑ دیئے۔ اس نے اس میں صرف کیریکٹر نگاری کو مدنظر رکھا۔ داستان کے تسلسل اور اسٹیج کے قواعد کی کوئی پروا نہیں کی۔ جرمن پبلک نے بڑے زور و شور سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس مصنف کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی لیکن ہرڈر کی مشکل پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا اور اس نے گوئٹے کو بہت سرزنش کی اور لکھا کہ شیکسپیئر نے تمہیں خراب کر دیا۔

اس زمانے میں عشق نے پھر گوئٹے کی جراحت دل کی پرسش کی۔ وہ اپنے ایک دوست کی بیوی لوٹے کیسٹنر پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ لوٹے، اس سے دوستانہ تلطف کا برتاؤ کرتی تھی لیکن اس کا ناز پاک دامنی گوئٹے کے نیاز عشق کو ہمیشہ رد کرتا تھا۔ شاعر نے اپنے قلب کی بے چینی کی تصویر شعر منشور میں کھینچی اور اس قصے کا نام ''نوجوان ویرٹھر کے مصائب رکھا۔ (1774ء) ویرٹھر ایک شادی شدہ حسینہ پر عاشق ہوتا ہے، اپنے جذبات مضطرب کا اظہار عاشقانہ خطوط میں کرتا ہے

اور آخر درد فراق کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتا ہے۔ یہ قصہ گوئٹے نے بے خودی کے عالم میں ایک مہینے میں ختم کیا۔ گوئٹے کی عمر کا یہ دور سراپا طوفان و ہیجان ہے اور ویرتھر اس کا سچا مظہر ہے۔ گوئٹے بہت کوشش کرتا تھا کہ وکالت کے پیشے میں جی لگائے لیکن اس کا سیماب وش دل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایک تاجر کی لڑکی سے شادی کر لے۔ نسبت بھی ہو گئی لیکن اختلاف معاشرت اور اختلاف مذاق کے سبب سے شادی کی نوبت نہ آئی۔

1775ء میں گوئٹے نے ''فاؤسٹ'' لکھا۔ ابتدائی شکل میں یہ طوفان و ہیجان کا ڈرامہ تھا لیکن آگے چل کر کچھ اور ہی چیز بن گیا۔ اسی سال گوئٹے کو وائمار کے نوجوان فرماں روا ڈیوک کارل آگسٹ نے اپنا مشیر مقرر کر کے بلا بھیجا۔ گوئٹے بھی فرانکفرٹ کی پر آشوب زندگی اور مایوسی عشق کی تلخیوں سے عاجز آ گیا تھا۔ علاوہ اس کے وائمار کے دربار میں جانے سے اسے امید تھی کہ وکالت کی محدود زندگی سے نجات پا کر جاہ و منصب ثروت اور عزت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لیے اس نے خوشی سے منظور کر لیا۔ نوجوان ڈیوک اور جوان شاعر میں کچھ دن قبل پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور انہیں ایک دوسرے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اسی کی بدولت گوئٹے کو کارل آگسٹ کا قرب حاصل ہوا اور اس قرب سے عمر بھر کی سچی دوستی کی بنیاد پڑی۔ وائمار میں گوئٹے کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا جس نے بتدریج اس کے مزاج اور اس کی سیرت میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کی۔ درباری زندگی کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے سبب سے بہت دن تک اس کی شاعرانہ تخلیق کا سرچشمہ بند رہا لیکن گوناگوں تجربوں کی بدولت سطح کے نیچے آب حیات کا خزانہ جمع ہوتا رہا جو آگے چل کر ابلا اور بحر ذخار بن کر ابلا۔

فرینکفرٹ ہی میں گوئٹے نے اپنا ڈرامہ ''ایگمونٹ'' شروع کر دیا تھا مگر یہ وائمار جانے کے 12 برس بعد 1787ء میں ختم ہوا۔ یہ ایک امیر کا قصہ ہے جو ایک نیچے طبقے کی عورت پر عاشق تھا۔ اس کی راہ میں ہزاروں خطرے تھے مگر اسے کسی کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ آخر وہ ورطہ ہلاکت میں غرق ہو گیا۔ اس قصے میں گوئٹے کا ڈیمون (Demon) کا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی سیرت کا لاشعوری عنصر ہے جو حرکت اور تخلیق کی قوت کا خزانہ ہے۔ اس کی بدولت انسان زندگی کی سنگلاخ راہوں میں بے جانے بوجھے' بے دیکھے بھالے آگے بڑھا چلا جاتا ہے چاہے جو انجام ہو۔ اس نئے رومانی دور میں گوئٹے اس کا قائل ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس مخفی قوت

کے ہاتھ میں چھوڑ دینا انسان کی نجات کا باعث ہے۔ ان دنوں اس کی تصانیف پر بلکہ اس کی ساری زندگی پر بے خبری کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

جیسا ہم کہہ چکے ہیں وائمار آنے کے بعد چند سال تک گوئٹے دربار کی لاابالی زندگی اور ہم سن اور ہم مشرب احباب کی پرلطف صحبتوں میں ایسا ڈوبا رہا کہ اسے سوا چھوٹی چھوٹی ہنگامی چیزیں لکھنے کے تصنیف و تالیف کا بالکل موقع نہیں ملا۔ ڈیوک کارل آوگسٹ ان دنوں عہد شباب کی رندی و سیہ مستی کی داد دے رہے تھا۔

گوئٹے اس کی بزم عشرت میں شمع فروزاں بن کر پہنچا۔ سفر میں حضر میں دربار میں شکار میں وہ ڈیوک کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی طبیعت کی رنگینی' شوخی اور اپج سے عیش و مسرت کی نئی نئی راہیں نکالتا تھا مگر اس کی روح اس زندگی سے مطمئن نہ تھی۔ مبداء فیاض نے اسے جو جوہر قابل عطا کیا تھا وہ نشوونما کے لیے بے چین تھا۔ اس کے دل میں جوش جوانی اور احساس فرض آرزوئے عشق اور تمنائے تخلیق میں شدید کشمکش تھی۔

اس روحانی تلاطم میں گوئٹے کی دستگیری اس چیز نے کی جو بہتوں کو گرداب بلا میں مبتلا کرتی ہے یعنی عشق و محبت نے فراو فان اشٹائن' نے جو ریاست وائمار کے ایک عہدیدار کی بیوی تھی حسن صورت اور جمال سیرت کی موہنی سے جوان شاعر کے دل کو موہ لیا۔ یہ خاتون گوئٹے سے عمر میں بڑی تھی۔ وقار' متانت' نفاست' مذاق' اصابت رائے اور حسن تدبیر میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ کچھ اس کی واقعی صفات اور شاعر کے تخیل کی کمال بینی (Idealization) غرض گوئٹے اسے صنف نسوانی کا کامل نمونہ سمجھتا تھا۔ ان دونوں کی محبت برسوں تک افلاطونی عشق کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔ گوئٹے اس سے کاروبار میں تصنیف و تالیف میں غرض ہر چیز میں مشورہ لیتا تھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتا تھا۔ جوش جوانی کے تقاضے سے وہ روحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل کا بھی طالب تھا مگر اس کی معشوقہ مدتوں ان پیارے حیلوں سے جنہیں کچھ پاک دامن اور شائستہ عورتیں ہی خوب جانتی ہیں ٹالتی رہی۔ آخر گوئٹے کی دل کی مراد پوری ہوئی۔ اگرچہ بعض وقتوں کی وجہ سے نکاح نہ ہو سکا مگر دونوں کے تعلقات اسی قدر گہرے اور استوار تھے جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں اور آخر عمر تک ایسے ہی رہے۔

فراو فان اشٹائن کے اثر سے گوئٹے کی سیرت میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا۔ اس نے اپنی

لاابالی زندگی بالکل ترک کردی اور وہ ضبط نفس حاصل کیا جس پر زاہدوں کو بھی رشک آئے۔ وہ محنت فرض شناسی کفایت شعاری اور پابندی اوقات کا پتلا بن گیا جو انتظامی فرائض اس کے سپرد تھے ان سے اس کی طبیعت کو ذرا بھی مناسبت نہ تھی لیکن طبیعت پر انتہائی جبر کر کے اس نے محنت اور دیانت سے اپنے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ اسے وائمار کی رعایا کی بہبودی کا سوتے جاگتے ہر وقت خیال رہتا تھا اور اس کے لیے وہ نت نئی تدبیریں سوچتا تھا اور ان پر مستعدی اور تن دہی سے عمل کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی سعی سے ملک کے نظم ونسق میں کوئی دیرپا خارجی نتائج حاصل نہیں ہوئے مگر اس میں اس کا قصور نہ تھا اور پھر یہ فائدہ کیا کم ہے کہ خود گوئٹے کی سیرت میں اس عملی جدوجہد سے پختگی اور یکسوئی پیداء ہوگئی اور اسے انسانی زندگی میں وہ بصیرت حاصل ہوگئی جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے نوجوان ڈیوک کی تربیت اور اصلاح کی کوشش شروع کی جو ابتدا میں تو بالکل کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کے انتہائی استقلال کی بدولت آخر میں اپنا اثر دکھا کر رہی۔ مدبر کی حیثیت سے گوئٹے نے وائمار کو کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچایا لیکن معلم کی حیثیت سے اس نے وائمار کے فرماں رواں کو رند لاابالی سے فرض شناس اور خوش تدبیر حکمراں بنادیا۔

اس عرصے میں اس کی تصنیف بہت محدود رہی۔ زیادہ تر توجہ غنائی شاعری کی طرف تھی۔ دو ڈرامے ''افی گینیا'' اور ''تاسو'' اس نے شروع کیے مگر انہیں ختم نہ کر پایا۔ ان ڈراموں کے جو حصے اس نے اس زمانے میں لکھے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا شاعرانہ عقیدہ بدل چلا ہے۔ وہ انسان کے فطری جوش طبیعت کا قائل ہے لیکن اخلاق وتمدن کے ضابطوں کی روحانی قوت بھی اسے نظر آنے لگی ہے۔ اسے یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں امتزاج کی ضرورت ہے لیکن ابھی اس امتزاج کی کوئی شکل اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے لیے اسے کسی خارجی اثر کی ضرورت ہے مگر یہ اثر جرمنی میں نہیں ملتا۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ اس کا دل خود بخود اطالیہ کی طرف کھنچ رہا ہے۔

1786ء کے آغاز میں گوئٹے کی طبیعت بہت بے چین ہے۔ اپنی شاعرانہ قوت تخلیق کے رک جانے کا اسے بے حد صدمہ ہے۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ انتظامی کام اس کے بس کا نہیں۔ بے دلی سے کام کرنا اسے گوارا نہیں۔ وہ رسیاں تڑا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا تو

خدا جانے کب تک اس حیص بیص میں رہتا مگر گوئٹے کی طبیعت کمزور نہیں۔ اس میں بلا کی قوت ہے جو پچھلے چند سال کی باضابطہ زندگی کی بدولت اور پختہ ہوگئی ہے۔ وہ جلد فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اطالیہ کا سفر کرنا چاہیے اور ڈیوک سے اجازت لے کر اپنے دوستوں سے مشورہ کیے بغیر چل دیتا ہے۔

اطالیہ میں اس کا قیام دو سال سے زیادہ رہا۔ اس ملک میں اسے وہ چیز مل گئی جسے اس کا دل مدت سے ڈھونڈتا تھا۔ یہاں کی خوشنما پرانی عمارتوں میں، یہاں کے عجائب خانوں میں، یہاں کی آرٹ گیلریوں میں اسے قدیم یونانی رومی تمدن کے نمونے اور کلاسیکی روح کے مجسمے ملے۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ انسان نے کس طرح اپنی فطرت کے ابھار اپنی طبیعت کی اپج کو ترتیب اور ہم آہنگی کے ضابطوں سے جکڑ کر خوشنما اور مفید بنایا تھا۔ کس طرح طوفان و ہیجان کو اخلاقی اور معدنی اصولوں کے پشتوں سے قابو میں لا کر راہ پر لگایا تھا۔ اطالیہ میں آکر گوئٹے کی زندگی کا چوتھا دور شروع ہوا جو اصل میں اس کی شاعرانہ تخلیق کا آغاز تھا۔ زندگی کے مطالعے کے لیے اسے جس بصیرت کی حاجت تھی وہ مل گئی۔ اس کے دھندلے خیالات واضح ہوگئے، اسے اپنا نصب العین صاف نظر آنے لگا۔

علاوہ اس کے فرحت بخش جنوبی آب و ہوا میں سکون و تنہائی کی زندگی بسر کرنے سے گوئٹے کو اپنی پچھلی زندگی پر تبصرہ اور آئندہ زندگی کی تیاری کرنے کا موقع ملا۔ یہاں اس نے اپنی کل پرانی تصانیف پر نظر ثانی کی ''ایگمونٹ'' جو اس کی بے خودی اور وارفتگی کے عہد کی یادگار تھا، ختم کیا۔ افی گینیا جو اس کے ہوش اور خودداری کے دور کی تمہید تھی مکمل کی۔ ٹاسو کا اکثر حصہ اور فاؤسٹ کے کچھ سین لکھے۔ فاؤسٹ کا جو خاکہ اس کے ذہن میں تھا وہ بالکل بدل گیا۔ اس کی تفصیل ہم آگے کے صفحات میں کریں گے۔ افی گینیا کا قصہ ایک قدیم یونانی روایت پر مبنی ہے۔ مشہور یونانی شاعر یوری پیڈس نے بھی اس پر ڈرامہ لکھا ہے۔ یہ ایک بہادر اور عقل مند لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے باپ کے قول کو پورا کرنے اور اپنے ملک کی مدد کے لیے آرٹمیس دیوی کے مندر میں قربان کیے جانے پر تیار ہوگئی مگر اپنی دانشمندی اور دیوی کی مدد سے اس نے اپنی جان بھی بچالی اور اپنے ملک کی لاج بھی رکھ لی۔ اس ڈرامے میں گوئٹے نے کلاسیکی طرز ادا کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ یہ قدیم یونانی طرز کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے بھی یہ قصہ شاہد ہے کہ اب

گوئٹے مذہب، واخلاق کو جس کا وہ ابتدائی دور میں مخالف تھا اور ہی نظر سے دیکھتا ہے۔

''ٹاسو'' میں اگرچہ گوئٹے نے جدید عہد کے ایک شاعر کا قصہ لکھا ہے لیکن ہر اعتبار سے یہ ڈرامہ بھی کلاسیکی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر کی بے چین اور حساس طبیعت اس کی عاشق مزاجی اس کے والہانہ جوش اس کی شہرت پسندی' اس کی رقابت کی تصویر دکھانے میں گوئٹے نے کمال کر دیا ہے۔ ٹاسو کے حریف مدبر کا کیرکٹر بھی بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

اصل میں اس ڈرامے میں گوئٹے یہ اعتراف کرتا ہے کہ شاعر اپنی نازک مزاجی' اپنی زود رنجی' اپنی لطافت طبع کے باعث عملی زندگی کی سختیوں اور ناہمواریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کی کشتی حیات ان چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔

1788ء میں اطالیہ سے واپسی کے بعد گوئٹے نے انتظامی اور عملی کاموں میں حصہ لینا کم کر دیا اور آہستہ آہستہ تخیل و تفکر کے کنجِ عزلت میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ جو خدمتیں اس نے اپنے ذمے لیں بھی وہ ایسی تھیں جن سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ کچھ دن وہ وزیر تعلیم رہا اور مدتوں دربار کے تھیٹر کا منتظم۔ 1789ء میں گوئٹے نے ٹاسو ختم کر لیا۔ دوسرے سال اس کی اس وقت تک کی تصانیف کا مجموعہ شائع ہوا جن میں فاؤسٹ بھی Fragment (ایک ناتمام ٹکڑے) کے نام سے شامل تھا۔

یہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا۔ گوئٹے کو ابتدا میں اس تحریک سے بڑی ہمدردی تھی۔ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ سے وہ امارت پسند تھا لیکن اس کو عوام کے طبقے سے بڑی محبت تھی۔ ابھی تک اس کے دل سے طوفان و ہیجان کی یاد محو نہیں ہوئی تھی جس کا نعرہ جنگ ''آزادی'' تھا۔ فرانس کے عوام کو امراء کے جبر و استبداد سے آزاد ہوتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ جب نپولین نے ریاست پروشن (Prussia) سے جنگ چھیڑی تب بھی گوئٹے کی ہمدردی اس اولوالعزم فاتح کے ساتھ تھی۔ وائمار نے جب وطن کے جوش میں پروشن کا ساتھ دیا تو گوئٹے کو بڑا صدمہ ہوا۔ اسے اپنے ملک سے جتنی محبت تھی وہ کم لوگوں کو ہوگی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نپولین نے تمام یورپ کو آزاد کرانے اور ایک نئے اور اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وائمار میں کوئی اس معاملے میں اس کا ہم خیال نہ تھا' اس لیے اس کی دلچسپی انقلاب سے رفتہ رفتہ کم ہوگئی اور وہ حکیمانہ بے تعلقی سے اس کی نشوونما کا مطالعہ کرنے لگا لیکن نپولین سے اسے ہمیشہ عقیدت رہی۔

ان دنوں وائمار میں ایک نوجوان شاعر آیا ہوا تھا جو جرمنی کے آسمان سخن پر گوئٹے کے پہلو بہ پہلو چمکنے والا تھا۔ شلر، جس کا نام آج تک گوئٹے کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے افتادِ طبیعت، شاعرانہ عقائد، طرزِ ادا غرض ہر چیز میں گوئٹے سے مختلف تھا۔

سن رسیدہ گوئٹے خوددار، بھاری بھر کم، صابر اور دور اندیش تھا اور نوجوان شلر بے تکلف، گرم جوش، جلد باز اور ناعاقبت اندیش شلر صرف شاعر نہ تھا بلکہ اس نے تاریخ اور فلسفے کا بھی عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ فلسفے میں وہ کانٹ کا پیرو تھا اور جمالیات کے شعبے میں اس نے کانٹ کے خیالات کو بنیاد قرار دے کر بڑے گہرے اور بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں۔ اپنی شاعری میں بھی وہ ایک حد تک فلسفیانہ اصول کا پابند تھا اور منطقی تحلیل سے، جس حد تک شاعر کام لے سکتا ہے لیتا تھا۔ گوئٹے رسمی فلسفے سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کی فطری ذہانت اس کی وسیع نظر اس کے گہرے مطالعے اس کے طویل تجربے نے اسے فلسفہ زندگی میں وہ بصیرت بخشی تھی جو شلر تو کیا عہد جدید کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی پھر ہمہ گیری کے اعتبار سے بھی شلر کو اس سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مجرد فلسفہ نہ سہی لیکن سائنس کے ہر شعبے میں اور دوسرے علوم وفنون میں گوئٹے اہل فن کا سا دخل رکھتا تھا۔ تاہم اس نے شلر کی طرح شاعری کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی تھی بلکہ فلسفے کی شاعری پر۔ وہ فلسفے کی عینک سے زندگی کا مطالعہ نہیں کرتا تھا بلکہ شاعر کی نظر سے اس کا مشاہدہ کر کے فلسفیانہ نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا جو لوگ شاعری کی حقیقت سے واقف ہیں انہیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ گوئٹے کا اصول صحیح ہے اور شلر کا غلط۔ کلام زورِ صفائی، چستی کے لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے لیکن اس میں وہ گہرائی نہیں جو گوئٹے کے یہاں پائی جاتی ہے۔ شلر کا کوئی ڈرامہ فلسفیانہ نہیں کہا جاسکتا۔ گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کی بلند ترین فلسفیانہ نظموں میں شمار ہوتا ہے۔

شلر کو گوئٹے سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ اختلاف طبیعت، کچھ عزلت پسندی، کچھ رشک کے سبب سے بہت دن تک کتراتا رہا۔ آخر دونوں میں ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ انہیں ایک دوسرے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہونے لگا۔ 1794ء تک اس دوستی کی بنیاد مضبوط ہو چکی تھی اور باہمی تاثیر و تاثر کا وہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا جس نے دونوں کا حوصلہ بڑھایا اور دونوں کے کلام میں چار چاند لگا دیئے۔

شلر کی دوستی سے گوئٹے کی زندگی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے اور یہی دور اس کی شاعری

اور معنی آفرینی کا زرین عہد ہے۔ شلر کے جوش جوانی اور حوصلہ مندی نے گوئٹے کے دل میں شاعری کی دبی ہوئی آگ کو ابھارا اور اسی کے مشورے اور اصرار سے گوئٹے نے ان معرکہ آراء تصانیف کو پھر ہاتھ لگایا جنہیں وہ مدت سے چھوڑ چکا تھا۔ اب شلر، گوئٹے کا ادبی مشیر بن گیا اور اسی کے اثر سے گوئٹے کو اپنی تصنیف میں تنقید اور تنظیم کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ اب تک اس کی طبیعت ایک پہاڑی ندی کی طرح بے قید تھی اور جدھر من کی موت ہوا دھر بہتی تھی۔ اب اس نے اسے ایک نہر کی طرح سوچ سمجھ کر معینہ راستوں پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیف و کم دونوں کے لحاظ سے اس کی تصنیف نے بہت ترقی کی۔ اب وہ زندگی کے منفرد پہلوؤں کی مصوری سے آگے بڑھ کر مجموعی انسانی زندگی کا نقاش بن گیا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "ولیہم مائسٹر کا زمانہ شاگردی" ہے۔ کسی زمانے میں اس نے ایک نوجوان کا قصہ لکھا تھا جو تھیٹر کی تماشا گری کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے اور برسوں اس کوچے میں سرگرداں رہ کر عجیب وغریب تجربات حاصل کرتا ہے۔ اب گوئٹے نے اس قصے کو دوبارہ لکھا اور ایک شاہکار بنا دیا جس کا جواب اگر جرمن ادب میں مل سکتا ہے تو فاؤسٹ ہی ہے۔ اب یہ گوئٹے کے فلسفہ زندگی اور فلسفہ تعلیم کا آئینہ بن گیا۔ اس میں گوئٹے نے یہ دکھایا کہ سچی تعلیم وہ ہے جو انسان زندگی کی سختیاں جھیل کر اور ٹھوکریں کھا کر حاصل کرتا ہے۔ بہ شرطیکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کا شوق گوئٹے کو شلر نے دلایا تھا۔ گوئٹے جو زندگی کے مدرسے سے حکمت و بصیرت کی سند لے چکا تھا اب اس طرف متوجہ ہوا کہ دوسروں کو راہ دکھائے اور تعلیم دے۔ شلر نے "ہینا" سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا تھا۔ گوئٹے نے اس میں تنقیدی اور طنزیہ مضامین لکھے۔ ان میں فن تنقید کے وہ باریک نکتے بیان کیے گئے ہیں جن کی مثال جرمنی میں کیا دنیا کے ادب میں ملنا مشکل ہے۔

یہ چیزیں تو نثر تھیں۔ نظم میں گوئٹے نے وہ پیاری کتاب "ہرمان اور ڈوروتھیا" لکھی جو خیالات کا پختگی اور طرز ادا کی سادگی کے لحاظ سے ہومر اور فردوسی کے کلام کی طرح سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دیہات کی سیدھی سادی زندگی اور دو پاک اور بھولی روحوں کے باہمی عشق کی تصویر ہے جس کا ہر رنگ دل کش اور ہر خط اثر آفریں ہے۔ اس کے اس عہد کے چھوٹے چھوٹے ڈراموں اور غنائی شعری میں بھی کلاسیکی رنگ چھایا ہوا ہے۔

ان چیزوں کے ساتھ گوئٹے فاؤسٹ پر بھی نظرثانی کرتا رہا۔ اس کی ہمہ گیر طبیعت ایک وقت میں ایک چیز پر قناعت نہ کرتی تھی۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف مختلف ادبی کام کرتا تھا بلکہ طبیعات، نباتیات، معدنیات وغیرہ کا نظری مطالعہ اور عملی تجربہ کرتا رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ نقاشی اور دوسرے فنون لطیفہ کا شغل بھی رہتا تھا۔ اس سرسری خاکے میں ہم گوئٹے کو صرف ادیب کی حیثیت سے دکھانا چاہتے ہیں ورنہ وہ تو ایسا جامع حیثیات شخص تھا کہ اس کی زندگی علم النفس کے ماہروں کے نزدیک ایک معما ہے۔ اس کی جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی کو اٹھا کو دیکھیئے تو ذہن انسانی کی وسعت اور ہمہ گیری کا حیرت انگیز نمونہ نظر آتا ہے۔

گوئٹے اور شلر کی دوستی کا یہ دور حکم قضا سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ شلر 1805ء میں سن کہولت کو پہنچنے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ گوئٹے کو اس کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کی فطری شگفتگی ہمیشہ کے لیے مرجھا کر اور اس کی خلقی امنگ ہمیشہ کے لیے دب کر رہ گئی۔ اس کی عزلت پسندی اب اور بھی بڑھ گئی۔ 1806ء میں اس نے اپنی ایک وفادار خادمہ سے نکاح کر لیا اور خارجی دنیا سے قریب قریب قطع تعلق کر کے اپنی تخیل اور تفکر کی دنیا میں، جو ظاہر میں محدود مگر اصل میں کل کائنات سے زیادہ وسیع ہے محو ہو گیا۔ مگر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ گوئٹے کی ادبی اور علمی جدوجہد ختم ہو گئی۔ اس نے اپنی نصف صدی کی زندگی میں تجربے اور مشاہدے کا اتنا بڑا خزانہ جمع کر لیا تھا اور تندہی اور محنت کی ایسی پختہ عادت ڈال لی تھی کہ اس کی عمر کے بقیہ 25 برس میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ بدستور جاری رہا۔

گوئٹے کی عمر کا یہ آخری دور غالباً انسانی زندگی کے مبصر اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں ہمیں ایک پیر دانشمندی کی تصویر نظر آتی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہے، جو اپنی فطری بے چینی، اپنی بے قید قوت تخلیق، اپنی بے روک جذبات پرستی کو ضبط و انضباط اصول و قواعد، عقیدے اور نصب العین کے قابو میں لا چکا ہے۔ اور اب سکون و اطمینان سے بیٹھ کر اپنے کام پر نظرثانی کر رہا ہے۔ وہ اپنے گھر سے باہر بہت کم نکلتا ہے لیکن اس کا گھر اہل علم وارباب ادب کا مرجع ہے۔ لوگ آتے ہیں اور اس کے فیض سخن اس کی حکمت و بصیرت سے مالا مال ہو کر جاتے ہیں۔ سارے جرمنی بلکہ سارے یورپ کی ادبی نشوونما اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ تنقید اور بزرگانہ مشوروں سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی

کوششوں کو سیدھی راہ پر لگاتا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رومانی تحریک جسے وہ دبا چکا تھا اب پھر نئی نسل میں ابھر رہی ہے مگر وہ اس سے خفا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شباب کا گرم خون ''طوفان و ہیجان'' بن کر ابلتا رہے گا مگر اسے یہ بھی یقین ہے کہ جیسے اس نے رومانی زندگی کی تپ مدتوں سہہ کر آخر میں ضبط و انضباط کی تبرید کی قدر پہچانی اسی طرح دوسرے بیمار بھی کریں گے اور انہیں اپنے علاج میں اس کے نسخوں سے بڑی مدد ملے گی۔ رومانیت کی دوا مل جانے سے وہ اتنا مطمئن ہے کہ اس عمر میں بھی کبھی کبھی یہ درد مول لیتا ہے اور اس کے سوز و ساز کا لطف اٹھاتا ہے۔

گوئٹے کی متعدد بہترین تصانیف اسی دور میں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں۔ 1808ء میں اس نے ''فاؤسٹ'' کا پہلا حصہ شائع کیا۔ اس کے کچھ سال بعد اس نے ''مشرقی مغربی'' دیوان لکھا۔ یہ اس کی متعدد غنائی نظموں کا مجموعہ ہے جو اس نے ایرانی شعرا خصوصاً ''حافظ'' کے کلام سے متاثر ہو کر لکھا۔ اسی کے جواب میں اقبال نے ''پیام مشرق'' لکھا تھا۔ اس کتاب نے جرمنی کے شاعرانہ حلقوں میں ہل چل ڈال دی۔ اس کی تقلید میں رومانی شاعروں نے متعدد کتابیں لکھیں اور ''شرقیات'' ایک مستقل شعبہ ادب بن گئی۔

اب گوئٹے نے پھر نثر کی طرف توجہ کی۔ ''انتخابی رشتے'' جو اصول فن کے لحاظ سے اس کا سب سے مکمل ناول ہے اسی عہد کی تصنیف ہے۔ یہ عورت اور مرد کے عشق کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ایک میاں بیوی کا جوڑا جن کی طبیعتوں میں باہم مناسبت نہیں ہے احساس فرض کے سبب سے کچھ دن ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرتا ہے مگر آخر میں میاں اپنی ایک عزیز لڑکی پر اور بیوی ماں کے ایک دوست پر عاشق ہو جاتی ہے۔ پاس آبرو اور اخلاقی قانون انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھتا اور ان کی زندگی کو برباد کر دیتا ہے۔ اس میں گوئٹے نے سماج کو انفرادی روح کی فریاد سنائی ہے لیکن اخلاقی قانون کی زور شور سے حمایت کی ہے۔ اس کا مقابلہ ''ویرتھر'' سے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب گوئٹے کا عقیدہ زندگی کتنا بدل چکا تھا۔

اس کے بعد گوئٹے نے ''ولہیم مائسٹر'' کا دوسرا حصہ ''ولیم مائسٹر کا زمانہ سیاحی'' کے نام سے لکھا۔ اس میں اس نے دکھایا ہے کہ ایک شخص جو جوانی میں ''طوفان حوادث'' کے ''مکتب'' میں تعلیم حاصل کر چکا ہے کیونکر زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اپنی قوم کی تنظیم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ''فاؤسٹ'' کے دوسرے حصے کی طرح یہ بھی گوئٹے کے فلسفہ حیات کا

دستورالعمل ہے۔ تعلیم کے متعلق جو گہرے خیالات اس میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ آج تک معلموں کے لیے سبق آموز ہیں۔

جب گوئٹے کی کتاب زندگی ختم ہونے کو آئی تو اسے اپنی سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا۔ ”شاعری اور حقیقت“ کے نام سے اس نے اپنے عہد شباب کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے۔ یہ صرف اس کی ابتدائی زندگی کی تصویر نہیں ہے بلکہ طوفان و ہیجان کی ادبی تحریک کا مرقع ہے۔ افسوس ہے کہ اسے اس کتاب کے ختم کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ ہمارے سامنے گوئٹے کی پوری زندگی کی کہانی خود اس کی زبانی موجود ہوتی۔

گوئٹے کی آخری تصنیف فاؤسٹ کا دوسرا حصہ ہے۔ اسے اس نے 1831ء میں ختم کیا اور دوسرے سال 83 برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہی ”فاؤسٹ“ جس کی تکمیل میں اس نے اپنی پوری عمر صرف کر دی ہماری بحث کا اصلی موضوع ہے۔ اس لیے ہم آئندہ بابوں میں اس کا ماخذ بتائیں گے، اس کی تدریجی نشوونما دکھائیں گے، اس میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں سنائیں گے اور آخر میں مفصل تبصرہ کریں گے۔

باب سوم

فاؤسٹ کا ماخذ

عہد قدیم میں انسان کا ذہن مشاہدے اور تخیل میں امتیاز نہیں کرتا تھا۔ اسے نظام کائنات کو سمجھنے کا شوق تھا مگر فطرت کی ظاہری قوتوں کا اتنا کافی علم حاصل نہ تھا کہ علت و معلول کے سلسلے کی کڑی سے کڑی ملا دے۔ اس لیے جہاں ضرورت ہوتی تھی وہ پوشیدہ قوتوں کے تصور سے کام لیتا تھا۔ اسی تصور پر جادو کا عقیدہ مبنی ہے۔ جو حکماء علوم فطرت کی تحقیق میں مصروف رہتے تھے وہ خود سحر کے قائل ہوں یا نہ ہوں عوام ان سب کو ساحر ہی سمجھتے تھے۔ عیسائیت نے ان قوتوں کو جو ساحری کا مبداء سمجھی جاتی تھیں بجائے دیوتاؤں کے شیاطین قرار دیا۔ قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ساحر شیطان کے مرید ہوتے ہیں لیکن کلیسا جو شیطان سے زیادہ قوی ہے انہیں اس کے پنجے سے چھڑا سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سی جادوگرنیوں کی کہانیاں مشہور تھیں جن کی روحوں کو روحانی پیشواؤں نے شیطان سے چھین کر مسیح کے حلقے میں داخل کیا۔ سولہویں صدی میں جب تجدید مذہب نے پوپ اور کلیسا کے تقدس کا پردہ چاک کر دیا اور لوگوں کو پادریوں کی مافوق الفطرت قوتوں پر اعتماد نہ رہا تو ساحروں کی کہانیوں کا رنگ بھی بدل گیا۔ اس زمانے کی کہانیوں میں جو ساحر شیطان کے ہاتھ اپنی روح بیچتا ہے اس کو کوئی نجات نہ دلاتا اور جب وہ مرتا ہے تو شیطان اس کی روح کو اپنی جہنم کی سلطنت میں بھیج دیتا ہے۔

اسی قسم کی کہانیوں میں سے فاؤسٹ کا افسانہ ہے۔ اس کی تاریخی اصلیت اتنی ہے کہ جان فاؤسٹ نامی ایک شخص مشہور عالم میلانشتوں کا ہم عصر اور ہم وطن تھا۔ اس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ 1516ء سے 1525ء تک ''ماؤل برون'' میں وہاں کے اسقف کے ساتھ رہا اور اس کے بعد وٹنبرگ میں آیا۔ یہاں اس نے اپنے آپ کو ساحر مشہور کیا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جرمنی کے شہنشاہ کو

میرے ہی جادو کی بدولت اطالیہ میں شکست ہوئی۔ میلانشوں نے اسے ان حرکتوں پر لعنت ملامت کی اور وہ گرفتاری کے خوف سے بھاگا اور عرصے تک مارا مار پھرنے کے بعد وٹنبرگ کے کسی گاتو میں مر گیا۔

سولہویں صدی کے نصف آخر میں لوگوں نے رنگ آمیزی کرتے کرتے اس کی زندگی کے حالات کو ایک عجیب وغریب افسانہ بنا دیا تھا۔ 1557ء میں فرنکفرٹ میں ایک قصہ Fallstbuch (کتاب فاؤسٹ) کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ یہی اصل میں گوئٹے کے ڈرامے کا ماخذ ہے۔

اس قصے کا ہیرو ایک کسان کا لڑکا ''جان فاؤسٹ'' ہے وہ جوانی میں وٹنبرگ میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جاتا ہے۔ اسے علوم ممنوعہ کے حاصل کرنے کا شوق ہے۔ وہ سحر و نیز نجات کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور بائبل کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ ''وہ عقاب کے پر لگا کر آسمان کے چپے چپے کی سیر کرنا چاہتا تھا'' وہ شیطان کے ہاتھ اپنی روح اس شرط پر بیچتا ہے کہ اس پر تمام پوشیدہ راز منکشف ہو جائیں اور تمام باطنی قوتیں اسے مل جائیں۔

فاؤسٹ آٹھ برس وٹنبرگ میں رہتا ہے اور اس کے بعد شیطان کے ساتھ قسطنطنیہ اور روما کی سیر کرتا ہے۔ وٹنبرگ میں طالب علموں کی ایک دعوت میں وہ قدیم یونان کی مشہور حسینہ ہیلن کی روح کو بلاتا ہے۔ وہ اس روح سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے بطن سے اس کا ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جب اس کے اور شیطان کے معاہدے کی میعاد ختم ہوتی ہے تو فاؤسٹ اپنے کیے پر پچھتاتا ہے اور شیطان جسے اپنی جیت کا یقین ہے اس سے یوں کھیلتا ہے جیسے بلی چوہے سے۔ اپنی زندگی کا آخری دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وٹنبرگ میں بسر کرتا ہے۔ ابر و باد کے تند و تیز طوفان میں وہ ایڑیاں رگڑ کر جان دیتا ہے اور اپنی روح شیطان کے حوالے کرتا ہے۔

1590ء میں اس کتاب کا جرمن سے انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ تھوڑے ہی دن بعد مارلونے اس قصے کو ڈرامہ کے طرز پر لکھ کر شائع کیا۔ انگلستان میں یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا اور وہاں سے تھیٹر کی کمپنیاں جو براعظم کا دورہ کیا کرتی تھیں اسے جرمنی لائیں۔ جرمنی کے اسٹیج پر ان دنوں فرانسیسی ناٹکوں کا قبضہ تھا۔ یہ قصہ وہاں بہت دن تک کٹھ پتلی کے تماشے میں دکھایا جاتا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں لیسنگ نے جس کی بدولت جرمن ادب میں نئی روح پیدا ہوئی جرمن اسٹیج کو بھی فرانسیسی اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے متعدد اور یجنل ڈرامے لکھے اور اسی سلسلے میں فاؤسٹ کے قصے کو بھی ڈرامہ کی صورت میں لانا چاہا لیکن ایک سین سے زیادہ نہ لکھ پایا۔

غرض فاؤسٹ کا قصہ جرمنوں کے قومی تخیل کا عکس تھا اور صدیوں سے خاص و عام میں مقبول تھا۔ لوگ اسے ''کتاب فاؤسٹ'' میں پڑھتے تھے' کٹھ پتلی کے تماشے میں دیکھتے تھے اور کہانیوں میں سنتے تھے۔

باب چہارم

فاؤسٹ کی تدریجی نشو ونما

گوئٹے کے حالات زندگی کے بیان میں ہم ضمناً ''فاؤسٹ'' کی تصنیف کا ذکر کر چکے ہیں لیکن اس ناٹک کے سمجھنے کیلئے اس کی نشوونما سے تفصیلی واقفیت ہونا ضروری ہے۔ گوئٹے کو بچپن سے قصوں اور تماشوں کا شوق تھا۔ اس سلسلے میں اسے فاؤسٹ کے افسانے سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس نے کٹھ پتلی کے تماشے میں یہ قصہ بار ہا دیکھا تھا اور ''کتاب فاؤسٹ'' بھی یقیناً اس کی نظر سے گزری تھی۔ اگر چہ یہ پتا نہیں چلتا کہ اس نے یہ کتاب اپنا ناٹک شروع کرنے سے پہلے پڑھی تھی یا اس کی تصنیف کے دوران میں مارلوؔ کے ناٹک ''ڈاکٹر فاؤسٹس'' کا نام اس نے چاہے پہلے بھی سنا ہو لیکن اس کے مطالعے کا اتفاق اسے 1829ء میں ہوا جب وہ اپنے فاؤسٹ کا دوسرا حصہ ختم کر رہا تھا۔ اس افسانے کا جرمنی میں مشہور اور مقبول عام ہونا اور گوئٹے کا اس سے بچپن سے دلچسپی رکھنا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ اس کے دل میں اس موضوع پر ایک ناٹک لکھنے کا خیال پیدا ہوتا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ 1768ء میں جب وہ 19 برس کی عمر میں لائپزش سے بیمار ہو کر لوٹا اور دو برس کے قریب فرینکفرٹ میں اپنے گھر پر مقیم رہا تو اسے ایسی صحبت میں رہنے اور ایسی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا کہ قرون وسطیٰ کے سحر، نیرنجات، الکیمیا وغیرہ سے جو فاؤسٹ کے قصے کی بنیاد ہیں اسے انتہائی دلچسپی پیدا ہو گئی اور ان خیالات و استعارات پر پورا عبور حاصل ہو گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے معالج اور اس کی تیماردار (یعنی اس کی ماں کی دوست فروئلائن فان کلیٹنبرگ) دونوں کو یہودیوں کے علوم باطنی کی کتاب Cabala اور دوسری سحر و نیرنجات کی کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا اور عملیات میں بھی انہماک تھا۔ ان دونوں نے گوئٹے کو بھی ان چیزوں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ گوئٹے کا وسیع تخیل اثر پذیر قلب 19 برس کی عمر،

احسان مندی کا جذبہ بھلا جب اتنی چیزیں اکٹھا ہو جائیں تو اسے اس کوچے کی خاک چھاننے کا شوق کیوں کر نہ پیدا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری سے اٹھنے کے بعد وہ دن رات سحر والکیمیا کی کتابوں کو پڑھنے اور ان کے نسخوں کو تیار کرنے میں مصروف رہا کرتا تھا۔ محقق کی حیثیت سے گوئٹے نے اس ضعیف الاعتقادی کو جس سے وہ عارضی طور پر مغلوب ہو گیا تھا' بہت جلد دل سے دور کر دیا لیکن شاعر کی حیثیت سے وہ اس نیرنگ تخیل میں ہمیشہ ڈوبا رہا۔ کوئی تعجب نہیں اگر فاؤسٹ کا قصہ جو اٹھارویں صدی کے عقلیت پسندوں کے نزدیک ایک کہانی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس کی نظر میں جیتی جاگتی تصویروں کا مرقع بن گیا اور اس نے آگے چل کر یہ ارادہ کیا کہ اپنی شاعری کی رنگ آمیزی سے اسے نقش ارژنگ کا حریف کر دے۔

اسٹراسبرگ میں ہرڈر سے ملاقات ہونے کے بعد اس تحریک کو اور قوت پہنچی۔ اس کی بدولت گوئٹے پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شاعری کے بڑے سے بڑے کارنامے وہی ہیں جن میں کسی قادر الکلام استاد نے عوام کے محبوب قصوں کو ان کے جذبات' خیالات اور معتقدات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ گوئٹے کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اسی زمانے میں اس کے دل میں ''فاؤسٹ'' اور ''گوتس فان برلیشنگن'' لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

لیکن جن لوگوں نے گوئٹے کی شاعری اور اس کی سیرت کا نظر غور سے مطالعہ کیا ہے وہ ان محرکات کے علاوہ کسی اور چیز کو ڈھونڈتے ہیں' جس نے باکمال شاعر سے یہ بے مثل نظم لکھوائی۔ اس میں شک نہیں کہ گوئٹے کی تصانیف عموماً خارجی مواد پر مبنی ہوتی ہیں۔ وہ تاریخی قصوں سے پرانی کہانیوں سے' اپنے زمانے کے واقعات سے' مناظر قدرت سے دل کھول کر کام لیتا ہے لیکن اس وقت جب یہ چیزیں اس کے باطنی تجربے' اس کی واردات قلب کا موضوع بن جائیں۔ اس کی شاعری اس کے دل کا آئینہ ہے۔ اس کی بہترین تصانیف اس کی زندگی کی تصویریں ہیں۔ اگر وہ یہ ناٹک محض اس بنا پر لکھتا کہ اسے فاؤسٹ کا قصہ بچپن سے پسند تھا یا اس نے نوجوانی میں الکیمیا اور نیرنجات کا مطالعہ کیا تھا یا ہرڈر نے اسے شعر العوام کی رف توجہ دلائی تھی تو یہ ایک معمولی سی چیز ہوتی جیسی اس کی بہت سی چھوٹی چھوٹی تمثیلیں ہیں۔ ایسا عظیم الشان ناٹک لکھنے کے لیے کسی گہری روحانی تحریک کی ضرورت تھی۔ اصل یہ بات ہے کہ اسٹراسبرگ کے قیام کے زمانے میں گوئٹے عنفوان شباب کی منزل سے گزر کر بلوغ کی سرحد میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کے قلب کی بے چینی

اور آرزؤ اس کی طبیعت کی ہمہ جوئی اور ہمہ گیری اظہار کا تقاضا کر رہی تھی۔ اسے اپنی شخصیت کی جھلک فاؤسٹ کے کیریکٹر میں نظر آئی۔ قصہ پیش نظر تھا۔ مواد موجود تھا بس اس نے فاؤسٹ کو اپنے دردِ دل کا ترجمان اس کے قصے کو اپنی زندگی کی کہانی بنالیا ہے جسے وہ ساری عمر کہتا رہا۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسٹراسبرگ کے قیام کے زمانے میں گوئٹے کے دل پر فریڈریکے بریوں کے عشق کی واردات گزر چکی تھی اور وہ مجبوراً اپنی معشوقہ کو دردِ فرقت میں تڑپتا چھوڑ آیا تھا۔ گوئٹے نے فاؤسٹ لکھنا شروع کیا تو یہ زخم ہنوز تازہ تھا۔ اس لیے اس نے پرانے قصے میں ایک نیا عنصر یعنی گریٹشن کی محبت کا واقعہ شامل کر دیا جس کی تصویر میں زیادہ تر فریڈریکے کا اور کسی حد تک اس گریٹشن کا عکس تھا جس پر گوئٹے پندرہ برس کی عمر میں عاشق ہوا تھا۔ گریٹشن کا قصہ فاؤسٹ کے پہلے حصے کی جان ہے بلکہ اس کے پہلے مسودے میں (جو 75ء میں تیار ہوا تھا) تو سوائے اس کے کچھ تھا ہی نہیں، پرانے قصے سے جو مشابہت تھی وہ محض برائے نام تھی۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ گوئٹے کو اصل میں پندرہویں صدی کی کہانی کہنا مقصود نہ تھا بلکہ وہ اس کے پردے میں اپنا افسانہ سنانا چاہتا تھا۔

بہرحال 1773ء میں جب گوئٹے نے اسٹراسبرگ سے آ کر فرینکفرٹ میں قیام کیا تو اس نے فاؤسٹ کی تصنیف کے خیال کو جو ایک سال سے اس کے دل میں تھا عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ 1774ء میں اس نے "کلوپٹ اسٹوک" کو اپنے مسودے کے وہ اجزاء سنائے جو اس وقت تیار تھے۔ 75ء میں جب وہ وائمار پہنچا ہے تو وہ پہلے حصے کے تمام سین جن میں گریٹشن کا ذکر ہے (سوائے کلیسا اور قید خانے کے سین کے) "آؤار باخ" کے تہ خانے کا سین اور شیطان اور طالب علم کی گفتگو لکھ چکا تھا۔ وائمار کے قیام کے پہلے دس سال گوئٹے کی زندگی کا عملی دور ہیں جن میں وہ مختلف انتظامی عہدوں پر مامور رہا۔ اس عرصے میں اسے تصنیف و تالیف کا موقع بہت کم ملا۔ 1780ء میں اس نے دوسرے حصے کا ایک آدھ سین لکھا۔ 1786ء میں جب وہ اطالیا گیا تو اس سرزمین کی جانفزا آب و ہوا سے اس کی دبی ہوئی قوتیں پھر ابھر آئیں اور روما میں اس نے فاؤسٹ کو پھر لکھنا شروع کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد 1790ء میں فاؤسٹ کے بعض اجزاء گوئٹے کی تصانیف کے مجموعے میں "ناتمام ٹکڑے" کے نام سے شائع ہوئے۔

اس کے بعد فاؤسٹ کی تصنیف کا سلسلہ پھر رک گیا اب گوئٹے کے ذہن میں فاؤسٹ کا

تصور کچھ اور ہی ہو گیا تھا۔ ابتداء میں وہ اپنے بے چین پُر آرزو دل کی تصویر گریٹشن کے قصے میں دکھانا اور پرانے افسانے سے محض اس تصویر کے چوکھٹے کا کام لینا چاہتا تھا لیکن زندگی کے نشیب و فراز نے خصوصاً اطالیا کے قیام نے اس کے دل میں زیادہ وسعت اور اس کے خیالات میں زیادہ گہرائی پیدا کر دی تھی۔ اب وہ فاؤسٹ کو آپ بیتی کی جگہ جگ بیتی اور رومانی روح کی فریاد کی جگہ رومانی اور کلاسیکی روحوں کا ہم آہنگ نغمہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ کام دشوار اور دیر طلب تھا اور یوں بھی گوئٹے کو کافی فرصت اور جمعیت خاطر حاصل نہ تھی۔ اس لیے چار پانچ برس تک اس نے فاؤسٹ کے پرانے مسودوں کو کھول کر بھی نہیں دیکھا۔ اس زمانے میں اس کی ملاقات "شلر" سے ہو چکی تھی اور اس دوستی کی بنیاد پڑ چکی تھی جس کی بدولت دونوں کو ایک دوسرے سے بے اندازہ روحانی فیض حاصل ہوگا۔ شلر، گوئٹے کا ادبی مشیر بن گیا تھا اور اس کی رائے کی گوئٹے بہت وقعت کرتا تھا۔ شلر نے فاؤسٹ کے شائع شدہ ٹکڑے کو دیکھ کر اس کی شاعرانہ فلسفیانہ اہمیت کا اندازہ کیا۔ وہ 29 نومبر 1794ء کو ایک خط میں گوئٹے کو لکھتا ہے: "مجھے آپ کے فاؤسٹ کے غیر مطبوعہ حصے پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے کیونکہ سچ پوچھئے تو جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہ ہرقلیس کے مجسمے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ ان اجزاء میں جو قوت تخیل اور رفعت طبع صرف کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے استاد کا کارنامہ ہے۔ میں چاہتا ہوں جہاں تک ممکن ہو اس کے بلند اور جری کیرکٹر کی پوری نشو و نما دیکھوں جو اس قصے کا روح رواں ہے۔" گوئٹے نے جو جواب دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے فاؤسٹ کی تکمیل کی بہت کم امید تھی۔ وہ لکھتا ہے: "فی الحال میں فاؤسٹ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اس بستے کو کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی جس میں وہ مقید ہے کیونکہ اگر میں ان مسودوں کو صاف کروں تو ان کی تکمیل بھی کرنا پڑے گی اور اس کی مجھ میں ہمت نہیں۔ اگر آئندہ کبھی یہ ہمت پیدا ہو گئی تو محض آپ کی ہمدردی کی بدولت۔" 1795ء میں گوئٹے نے "ینیا" جا کر شلر کو فاؤسٹ کا مسودہ دکھایا۔ شلر کی سچی ہمدردی اور محبت سے اس کے بجھے ہوئے دل میں نئے سرے سے ولولہ پیدا ہوا اور اس نے فاؤسٹ کی تکمیل کا ارادہ کر لیا۔ 1797ء میں گوئٹے نے "آسمان کا تمہیدی سین"، "تہدیہ" اور "پیچ کا گیت" لکھا، جس کے بعد وہ ابلیس کے دربار کا منظر دکھانا چاہتا تھا لیکن اس ارادے کو پورا نہ کر سکا اور اس نے بغیر ترتیب اور مناسبت کا خیال کیے ہوئے اسے ٹکڑے کو بھی قصے میں ٹھونس دیا۔ 1798ء میں اس نے "تماشا گاہ کا تمہیدی

سین‘‘ اور چند اور ابتدائی سین لکھے۔ 1800ء میں اس نے دوسرے حصے کے وہ سین لکھے جن میں ہیلن کا بیان ہے۔ اسی سال موسم خزاں میں اس نے پہلے حصے کو ختم کرنے کی کوشش کی اور والپرگس کی رات کا خواب اور والنٹائن کی موت کا سین لکھا لیکن بعض وجوہ سے کتاب اب بھی شائع نہ ہو سکی۔ 1805ء میں شلر کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے سے سر اٹھانے کے بعد گوئٹے نے فاؤسٹ کی طرف توجہ کی اور 1808ء میں پہلے حصے کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔

دوسرے حصے کے بہت سے سین اس سے پہلے لکھے جا چکے تھے لیکن پیرانہ سالی کے سبب سے گوئٹے کی طبیعت میں اب وہ پہلا ساز ور باقی نہیں رہا تھا۔ شلر کے مرنے سے اس پر ایسی افسردگی چھا گئی تھی کہ 1825ء تک اسے دوسرے حصے کی تکمیل کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس زمانے میں اس نے آنے والی موت کے اندیشے سے اپنے کام کے سمیٹنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ 1827ء میں فاؤسٹ کے دوسرے حصے کے ان اجزاء کو جن میں ہیلن کا ذکر ہے اس نے علیحدہ قصے کی صورت میں اپنی تصانیف کی ساتویں جلد میں شائع کرا دیا۔ اب وہ کم و بیش پابندی سے کام کرتا رہا لیکن عمر کے تقاضے سے رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ 1831ء میں دوسرا حصہ ختم ہو گیا اور سر بہ مہر کر کے رکھ دیا گیا کہ گوئٹے کے مرنے کے بعد شائع ہو۔ اس کے سات مہینے بعد 1832ء میں گوئٹے نے وفات پائی اور اسی سال فاؤسٹ کے دونوں حصے مکمل شائع ہوئے۔

باب پنجم

قصے کا خلاصہ

ہم دیکھ چکے ہیں فاؤسٹ کے مختلف حصے برسوں کے تفاوت سے لکھے گئے اور بعض ایسے اجزاء بھی اس میں شامل کر دیئے گئے۔ جو قصے میں کسی طرح نہیں کھپتے۔ اس کی وجہ سے علاوہ اور پیچیدگیوں کے ایک وقت یہ پیدا ہو گئی کہ واقعات میں تسلسل قائم نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے والے قصے کو اچھی طرح نہیں سمجھتے اور ان کی طبیعت اس کی صوری بے ترتیبی سے اس قدر الجھتی ہے کہ وہ معنوی خوبیوں کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے علاوہ ہم فی الحال صرف پہلے حصے کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جسے ختم کرنے کے بعد انجام معلوم کرنے کی خلش باقی رہتی ہے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ دونوں حصوں کے مضامین اس طرح بیان کر دیں کہ پورے قصے کا ایک مسلسل اور مربوط خاکہ پڑھنے والے کے پیش نظر رہے۔

اس میں ہم حتی الامکان اختصار کو مدنظر رکھیں گے لیکن فاؤسٹ بہت بڑی نظم ہے اور پھر فلسفیانہ نظم جس کا خلاصہ لکھنے میں بھی اہم مطالب کی تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے اگر کسی قدر طول ہو جائے تو امید ہے کہ پڑھنے والے صبر سے کام لیں گے۔

کتاب کی ابتدا میں ایک دلنشین اور دل گداز تہدیہ ہے جس میں شاعر اپنے جوانی کے دوستوں کو یاد کرتا ہے جنہیں وہ فرینکفرٹ میں اور وائمار کے قیام کے ابتدائی زمانے میں فاؤسٹ کا پہلا مسودہ سنایا کرتا تھا۔ 1897ء میں جب اس نے "تہدیہ" لکھا تو یہ پیار اور اخلاص کی صحبتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ اس کے اکثر دوست "چین کی گھڑیوں کی آرزوئیں کرتے کرتے تقدیر سے مایوس ہو کر" اسے جدائی کا داغ دے چکے تھے۔ اس لیے بندہ محبت پیکر وفا گوئٹے کو پہلا حصہ ختم کرتے وقت بے اختیار وہ روحیں یاد آتی ہیں جنہیں وہ جوانی میں اپنا گیت سناتا تھا اور جواب

''اس نغمے کے آخری سروں کو نہیں سن سکتیں'' انہیں کے نام پر وہ اپنی شاعری کے سب سے بڑے کارنامے کو معنون کرتا ہے۔ تقدیر کا کھیل دیکھیئے کہ فاؤسٹ اب بھی شائع نہ ہو سکا اور گیارہ برس بعد 1808ء جب اس کے چھپنے کی نوبت آئی تو گوئٹے کا آخری ولی دوست شلر بھی دنیا سے رحلت کر چکا تھا۔ جب بڈھے شاعر نے کتاب کو مطبع میں بھیجنے سے پہلے اس تمہیدیے پر نظر ثانی کی ہو گی تو اس کے قلب کے لیے ان الفاظ کا سوز و گداز اور بھی بڑھ گیا ہو گا ''جو چیزیں میرے پاس ہیں وہ دور نظر آتی ہیں اور کھوئی ہوئی چیزیں حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔''

''تمہیدیے'' کے بعد تماشا گاہ کا تمہیدی سین ہے جس میں گوئٹے ظریفانہ انداز میں اپنے ناٹک کی تقریب کرتا ہے۔ منیجر' شاعر اور مسخرے تینوں کے پردے میں خود گوئٹے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے تین پہلو دکھاتا ہے جن کے اتحاد عمل سے یہ ناٹک انجام کو پہنچا۔ منیجر کی حیثیت سے گوئٹے ان لوگوں کو خوش کرنے کی فکر میں ہے جو تماشے میں محض دل بہلانے آتے ہیں۔ وہ انہیں ''لکڑی کے تنگ گھروندے کے اندر ساری کائنات کا نقشہ دکھانا'' اور ''آسمان سے زمین' زمین سے پاتال تک کی سیر کرانا'' چاہتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ عوام کے مذاق کی پروانہ کرے اور ان ''اچھوتے'' مضامین کو جو اس کے ''قلب کی گہرائی'' میں پیدا ہوتے ہیں موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ نہ بننے دے بلکہ ''برسوں کے ریاض کے بعد مکمل صورت میں ظاہر کرے۔'' اسے آرزو ہے کہ ''رباب زندگی کے الجھے ہوئے تاروں کو سلجھا کر اور کس کر نغمہ حیات میں روانی پیدا کرے اور انفرادی روح کے سر کو کائنات کے مہاسر سے ملا کر ایک ہم آہنگ اور دل کش راگ سنائے۔'' مسخرے کی زبان سے وہ منیجر اور شاعر کی بحث کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ دونوں عناصر ضروری ہیں لیکن انہیں شعوری مقاصد کی حیثیت سے پیش نظر رکھنے سے سچا ڈرامہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ شاعر اپنے فرف وجدان کی مدد سے انسانی زندگی کا مشاہدہ کرے اور اسے اپنا موضوع بنالے۔ پھر ''عاشقی کے سودے'' کی طرح شاعری کا دھندا خود بخود چل نکلے گا اور ایسا مرقع تیار ہو جائے گا ''جس میں گوناگوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم' غلطیوں کا انبار اور حقیقت ذرا سی چنگاری'' ''اسی نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے سرور اور تقویت حاصل ہو۔''

اصل قصے کے شروع ہونے سے پہلے ''آسمان کا تمہیدی سین'' ہے ملائکہ مقربین' کائنات کی تعریف اور خالق کائنات کی تہلیل میں مصروف ہیں۔ شیطان بھی بارگاہ ایزدی میں حاضر ہے اور

انسان کی خود پسندی اور گمراہی پر خندہ زن ہے۔ صدائے غیبی اس کی سرزنش کے لیے فاؤسٹ کا ذکر کرتی ہے جو باوجود شک اور تاریکی میں مبتلا ہونے کے خدا کی بندگی کرتا ہے۔ شیطان جواب دیتا ہے کہ یہ شخص تو اوروں سے بھی بدتر ہے۔ اس کے حوصلوں کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ ''وہ تو آسمان سے اس کے روشن ترین ستارے مانگتا ہے اور زمین سے بہترین روحانی نعمتیں۔ قریب و بعید کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اس کے اضطراب قلب کو تسکین ہو۔'' شیطان کا دعویٰ ہے کہ اگر اسے اجازت ہو تو وہ فاؤسٹ کو بہت آسانی سے بہکا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''جب تک وہ دنیا میں ہے تجھے بہکانے کی ممانعت نہیں۔ جب تک انسان راہ طلب میں ہے اس کا بھٹکنا لازمی ہے۔'' انسان کا دست عمل جلد سو جاتا ہے اور اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اسے تیرا سا مصاحب دیتے ہیں جو اسے بہلائے' ابھارے اور آسمانی قوت تخلیق دے۔''

اب اصل ناٹک شروع ہوتا ہے۔ پہلا منظر فاؤسٹ کا کمرہ ہے۔ فاؤسٹ ایک ادھیڑ عمر کا پروفیسر ہے جس نے اپنی جوانی طلب علم میں صرف کی ہے لیکن علم سے اسے تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ وہ نہ حسن و عشق کے مزے سے واقف ہے نہ مشاہدہ فطرت کے کیف سے اور نہ لذت عمل سے۔ ان فطری رجحانات کے رکنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی بجائے ہم آہنگ وحدت کے ہنگامہ انتشار بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے دل میں اب تک صرف ایک آرزو تھی اور یہ وہ تھی کہ علمی تحقیق و تجربے کے ذریعے کائنات کی حقیقت معلوم کرے۔ اس نے اپنی آدھی عمر اس میں صرف کردی' راحت و مسرت کو اس پر قربان کردیا لیکن آخر میں یہ معلوم ہوا کہ علم انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔ اب اس کے دل پر یاس و حرماں کا دہرا بوجھ ہے۔ ایک تو یہ کہ طلب علم میں اس کی سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ دوسرے یہ کہ محض علم انسان کی روحانی تسکین کے لیے کافی نہیں۔ اب اس کی روح اصل میں عقیدت اور عمل کے لیے تڑپ رہی ہے لیکن اسے خود اس کا احساس نہیں۔ اسے شعوری حیثیت سے صرف یہ خلش محسوس ہوتی ہے کہ کائنات کا بھید معلوم کرنے کے لیے کوئی نزدیک کا راستہ ڈھونڈے۔ جو کام ادراک سے نہ ہو سکا وہ اب فاؤسٹ تخیل سے لینا چاہتا ہے۔ یوں تخیل کا موضوع آرٹ بھی ہے جس میں انسان وجدانی قوتوں کو صحیح تربیت کر کے شاہد حقیقت کا مشاہدہ ایک پیکر جمال کی حیثیت سے کرتا ہے لیکن اس کی بے صبر طبیعت بجائے تخیل کی اس دور و دراز راہ کے جہاں وہ عقل کو رہنما بنا کر چلتا ہے اس دلفریب پگڈنڈی کو اختیار کرتی ہے جس

سے انسان بظاہر چشم زدن میں منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے یعنی وہ بجائے آرٹ کے جادو کی مدد سے کائنات کا بھید معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے "میں اب فن ساحری کا مطالعہ کرتا ہوں۔ شاید اسی طرح میں کائنات کے اندرونی نظام سے واقف ہو جاؤں' مبداء حیات اور قوت خلاق کا مشاہدہ کروں اور الفاظ کی خردہ فروشی پر لعنت بھیجوں۔" وہ ایک جادو کی کتاب میں "کائنات اکبر" کا نقش دیکھتا ہے۔ اس کا اثر فوری اور حیرت انگیز ہے۔ اس کی آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور سارا نظام کائنات چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آتا ہے۔ وہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے "سبحان اللہ! ہر جزو کس ترتیب کے ساتھ کل کی تعمیر میں صرف ہوا ہے اور ہر ذرے کی حرکت اور زندگی کس خوش اسلوبی سے دوسرے ذروں سے وابستہ ہے۔ وہ دیکھو اجرام سماوی کس طرح تگاپو میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے سے کسب نور کر رہے ہیں۔ ان کی روشن کرنیں آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی ہیں اور شمیم سعادت برسا رہی ہیں۔ یہ ایک کی نوائے زندگی نغمہ کائنات سے ہم آہنگ ہے لیکن معاً اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ طلسمی منظر' یہ تخیل محض کارنامہ ایک سراب ہے جسے ایک لمحے سے زیادہ قرار نہیں۔ اس کی تشنہ دیدار روح اس کو دیکھ کر بجائے تسکین پانے کے اور بے قرار ہو جاتی ہے۔ وہ یاس و حسرت کے لہجے میں کہتا ہے "کتنا دلفریب تماشا ہے! مگر افسوس محض تماشا! اے نامحدود فطرت' میری نظر میں تیری بساط بس اتنی ہی ہے اے حیات و کائنات کے سرچشمو جن پر زمین و آسمان کا دارومدار ہے میں تمہیں سینے سے لگاؤں بتاؤ تم کہاں ہو؟ میرا تشنۂ وصال سینہ تمہاری طرف کھچ رہا ہے۔ ہائے! تم اُبلو تم سیراب کرو اور میں یوں پیاسا رہوں؟"

اب فاؤسٹ بے دلی سے کتاب کے ورق الٹتا ہے۔ دفعتاً روح ارض کا نقش نظر آتا ہے۔ اس کا خود فریب دل اسے یہ سمجھاتا ہے کہ اگر ساری کائنات کا بھید معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں تو کم سے کم کرۂ ارض اور انسانی زندگی کی حقیقت ضرور کھل جائے گی۔ اس کی دبی ہوئی امید پھر ابھر آتی ہے وہ روح ارض کو مخاطب کر کے کہتا ہے "اے کرہ ارض کی روح تو مجھ سے زیادہ قریب ہے' تجھے دیکھتے ہی میری قوتیں اُبھنے لگیں اور مجھے ایک نئی شراب نے مست کر دیا۔ میرے دل میں یہ ہمت پیدا ہو گئی کہ دنیا کی جوکھم اپنے سر لے لوں اور زندگی کے راحت و الم کا بوجھ اٹھا لوں' طوفانوں کا مقابلہ کروں' کشتی کے ڈوبنے کی آواز سے نہ ڈروں۔" لیکن تخیل کے نشے میں زندگی کے راحت و الم کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہو جانا اور بات ہے اور طوفان حیات کو دوبدو

دیکھنے کے بعد اس کا مقابلہ کرنا اور چیز ہے۔ فاؤسٹ کا خام کار ذہن آج ابھی زندگی کی خیالی تصویروں سے کھیل رہا ہے جو ہنوز عقیدت کے مزے سے محبت کی چاشنی سے، عمل کے ذوق سے ناآشنا ہے روح ارض کا سامنا کرنے کے قابل نہیں۔ جب وہ آتش پیکر یکایک ظاہر ہوتا ہے تو فاؤسٹ تاب نظارہ نہیں لاسکتا پھر بھی اسے دھندلا سا احساس ہے کہ اس کے اور روح ارض کے مابین کوئی رشتہ ضرور ہے۔ وہ اس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے ''اے وسعت کائنات میں پرواز کرنے والی، اے سرگرم عمل روح، مجھ میں تجھ میں کتنی مشابہت ہے۔'' روح ارض جانتی ہے کہ اس مغرور انسان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی روح میں بالقوۃ وہ تمام عناصر موجود ہیں جو روح ارض میں ہیں لیکن ان عناصر کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اسے اپنے نفس کی توسیع اور تہذیب کرنا ہے زر خام کو زندگی کی آگ میں تپا کر کندن بنانا ہے، تب جا کر وہ مخفی مشابہت جو دونوں روحوں میں ظاہر ہو سکتی ہے ابھی تک فاؤسٹ کی روح نامکمل اور اس کی نظر نارسا ہے، اس لیے اسے جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ روح ارض کا جلوۂ ناتمام ہے۔ یہ پراسرار تصویر فاؤسٹ کی نظر کو خیرہ کر کے، اس کی خود پسندی کو پامال کر کے یہ کہتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے'' تو اس روح سے مشابہ ہے جس کا تو ادراک کر سکتا ہے، مجھ سے نہیں۔'' فاؤسٹ اس تلخ جواب کو سن کر مایوسی، شرم اور ذلت سے بدحواس ہو جاتا ہے۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ اس کا مددگار شاگرد واگنر داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ طالب علم ہے جو دن رات مطالعے میں غرق رہتا ہے اور محنت، دیدہ ریزی، صبر و استقلال سے پرانی کتابوں کو چھان کر علمی مواد اکٹھا کرتا ہے جس سے وہ خود کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا لیکن کوئی اور شخص جو بہتر دل و دماغ رکھتا ہو، اسے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ واگنر صرف محقق ہے اسے نہ حکیم ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ اس کی آرزو۔ وہ اسی پر قانع ہے کہ بالواسطہ سّرِ کائنات کے حل کرنے میں جو حقیر خدمت اس سے بن آئے اسے انجام دے۔ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس وفادارانہ مدد سے فاؤسٹ کو کتنا فائدہ پہنچا۔ وہ اپنے استاد کا بے حد معتقد ہے اور اس سے استفادہ کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ اس نے فاؤسٹ کو روح ارض سے باتیں کرتے سنا تو سمجھا کہ وہ کوئی یونانی المیہ پڑھ رہا ہے۔ اگرچہ اب آدھی رات گزر چکی ہے اور درس و تدریس کا کوئی وقت نہیں لیکن اسے خطابت کا اتنا شوق ہے کہ تحت لفظ پڑھنے کا طریقہ اپنے استاد سے سیکھنے چلا آیا۔ فاؤسٹ کو اس کا آنا نہایت ناگوار ہوتا

ہے۔ دونوں میں فن خطابت اور علمی تحقیق کے متعلق جو گفتگو ہوتی ہے اس میں فاؤسٹ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اسے جھڑکتا ہے اور چاہتا ہے کہ کتابی علم کی طرف سے جو بے اعتمادی اسے پیدا ہوگئی ہے وہ واگنر کے دل میں بھی پیدا کرے لیکن واگنر اپنے محدود خیالات کے حلقے میں اس قدر مطمئن ہے کہ اس پر اس تلخ نوائی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ استاد کی طبیعت اس وقت بے کیف ہے اس لیے دوسرے دن صبح آنے کی اجازت لے کر چلا جاتا ہے۔

اب فاؤسٹ اکیلا ہے۔ اس کے دل پر حرمان ویاس کے خیالات نرغہ کر لیتے ہیں۔ مایوسی موت کا دروازہ ہے' فاؤسٹ' کی نظر ایک شراب کے پرانے شیشے پر پڑتی ہے جس میں اب زہر بھرا ہے' اسے دیکھ کر اس کے دل میں اطمینان و مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے چند قطرے اسے کشمکش حیات سے نجات دے دیں گے اور مرنے کے بعد اس پر راز کائنات خود بخود منکشف ہو جائے گا۔ وہ شیشے کو اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتا ہے۔ قریب ہے کہ زہر اس کے حلق سے اتر کر رگ و پے میں سرایت کر جائے کہ دفعتاً گھنٹوں کی آواز اور فرشتوں کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ صبح ہوگئی' ایسٹر کا دن شروع ہو گیا۔ ارض و سما میں مسیح کے دوبارہ زندگی ہونے کی یادگار میں خوشی منائی جا رہی ہے۔ فاؤسٹ کے دل میں عقیدت کی کھیتی سوکھ چکی ہے لیکن جڑیں ابھی باقی ہیں۔ اس نغمہ جانفزا کو سن کر بچپن کی بھولی بھالی خوش اعتقادی اور مذہبی کیف و سرور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے دل کی بے چینی دور نہیں ہوتی۔ مگر کچھ دیر کے لیے رک جاتی ہے۔ وہ زہر کے شیشے کو یہ کہہ کر رکھ دیتا ہے "بجے جاؤ اے آسمان کے نغمہ شیریں کہ گت! میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں' مجھے پھر زمین نے اپنا کر لیا۔"

جو عارضی سکون فاؤسٹ کے دل میں پیدا ہوا ہے وہ دن بھر باقی رہتا ہے۔ وہ واگنر کے ساتھ شہر کے باہر سیر کرنے جاتا ہے۔ سارا شہر ایسٹر کی تعطیل منا رہا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے گروہ تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر میدان میں سیلاب کی طرح امڈ آئے ہیں۔ گاؤں والے درختوں کے نیچے جمع ہیں اور ناچ رنگ کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ واگنر کتاب کا کیڑا انسانوں کے مجمع سے گھبراتا ہے۔ خصوصاً دیہاتیوں کے بھدے ناتراشیدہ مذاق سے اسے سخت کوفت ہوتی ہے مگر فاؤسٹ کے دل میں شک اور اضطراب کی تہوں کے نیچے انسانی ہمدردی کا جذبہ تھوڑی دیر کے لیے بیدار ہو گیا ہے۔ اسے اپنا بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے۔ جب وہ وبا کے زمانے میں اپنے باپ کے

ساتھ یہاں آ کر بیماروں کا علاج اوران کی خدمت کیا کرتا تھا۔ گاؤں والے احترام اور محبت سے اس کا استقبال کرتے ہیں' اس کے اور اس کے باپ کے احسانوں کا اعتراف کرتے ہیں' تھوڑی دیران لوگوں کے مجمع میں ٹھہرنے کے بعد وہ واگنر کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے۔ واگنر اسے اس کی ہر دلعزیزی پر مبارکباد دیتا ہے لیکن فاؤسٹ کے دل میں دھوکوں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ وہ واگنر کو بتاتا ہے کہ نہ اس کا باپ ان تعریفوں کا مستحق تھا اور نہ وہ خود ہے بلکہ ان دونوں کے سر ہزاروں غریبوں کا خون ہے' اس کا باپ الکیمیا کے مرکبات سے بیماروں کا علاج کرتا تھا جس سے بہت سے لوگ بے موت مر جاتے تھے مگر بیچارے گنوار سادگی اور جہالت کی وجہ سے اس کے معتقد تھے اور آج تک ہیں۔ ان کی تعریف فاؤسٹ کے کانوں کو طعن و تشنیع معلوم ہوتی ہے۔

کچھ دور چلنے کے بعد دونوں ایک پتھر بیٹھ کر ستاتے ہیں۔ فاؤسٹ کے دل میں انسان کی ظلمت اور جہالت کا احساس تازہ ہوگیا ہے اور یہ آرزو پھر ابھر آئی ہے کہ پرندوں کی طرح فضا میں پرواز کرے اور فطرت کے رنگارنگ جلوؤں کا قریب سے مشاہدہ کرے۔ واگنر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسان گھر بیٹھے صفحہ کتاب پر ساری کائنات کی سیر کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ وحشت کی لہر کیوں اٹھے۔ فاؤسٹ کو اس کی سادگی اور یک رنگی پر رشک آتا ہے۔ وہ کہتا ہے "تمہارے دل میں ایک ہی لہر ہے' خدا نہ کرے دوسری اٹھے' آہ! میرے سینے میں دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں نہیں بنتی' ایک تو کثیف لذتوں کے شوق میں دنیا سے چمٹی ہوئی ہے اور دوسری کو کد ہے کہ مجھے خاک سے اٹھا کر اس عالم پاک میں لے جائے جو میرے بزرگوں کی روحوں کی جلوہ گاہ ہے۔" یہ باتیں ہو ہی رہی ہیں کہ دور سے ایک کالا کتا دکھائی دیتا ہے جو قدم قدم پر چکر کھاتا ان دونوں کی طرف آرہا ہے۔ فاؤسٹ کو شبہ ہوتا ہے کہ کوئی بھوت ہے مگر واگنر اسے مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ معمولی کتا ہے۔

اب شام ہوگئی ہے۔ استاد اور شاگرد گھر کی طرف لوٹتے ہیں۔ کتا پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ فاؤسٹ اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھتا ہے۔ کتا جو اس کے ساتھ آیا ہے' آتشدان کے پیچھے ایک گدے پر لیٹتا ہے۔ ایسٹر کی برکت سے فاؤسٹ کو جو جمعیت قلب نصیب ہوئی تھی وہ اب تک باقی ہے اور شام کی تاریکی اس کی روح کے اعلیٰ جذبات کو ابھار رہی ہے مگر کتے کے غرانے سے اس کا سکون قلب غارت ہو جاتا ہے اور اضطراب اور بے چینی کا طوفان پھر امڈ آتا ہے۔ باوجود بے

اعتقادی کے فاؤسٹ کے دل کو اکثر ایسے موقعوں پر انجیل کی تلاوت سے تسکین ہوتی ہے۔اس وقت اسے یہ خیال آتا ہے کہ انجیل کا یونانی متن پڑھ کر معنوی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ جرمن زبان میں کرے۔

وہ ''کتاب تخلیق'' کی پہلی آیت کو پڑھ کر اس کے ترجمے پر غور کر رہا ہے۔کتا زور شور سے بھونکنا شروع کرتا ہے اور اس کا جسم پھول کر بڑھنے لگتا ہے۔فاؤسٹ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی خبیث روح ہے۔وہ جادو کی کتاب سے منتر پڑھتا ہے جس کے اثر سے سارے کمرے میں کہر چھا جاتا ہے اور اس کہر کے اندر سے وہ روح جواب تک کتے کی شکل میں تھی' ایک مُلّا کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔فاؤسٹ پوچھتا ہے تو کون ہے۔وہ پراسرار پیکر جواب دیتا ہے''اس قوت کا ایک جز جو ہمیشہ بدی کرنا چاہتی ہے اور ہمیشہ نیکی کرتی ہے..........وہ روح جو ہر چیز کا انکار اور ہر چیز کی نفی کرتی ہے۔''

یہ وہی شیطان ہے[1] جو درگاہ ایزدی سے اجازت لے کر فاؤسٹ کو بہکانے آیا ہے۔یہ اصل میں عشرت حیات اور قوت عمل کی روح کا ایک جز ہے' اور روح ارض کا مددگار۔اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں زندگی کی محبت اور عمل کا ولولہ پیدا کرے مگر چونکہ اس کی خلقت جوہر ناقص سے ہے اس لیے وہ دونوں باتوں میں حد سے گزر گیا ہے۔عشرت حیات کے سرور نے اسے بے قید جسمانی لذتوں کا پرستار اور قوت عمل کے نشے نے اسے تخلیق ایزدی کا حریف بنا دیا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ ہر انسان کو نفس پرستی میں مبتلا کر کے ''آسمانی نور کی پرچھائیں'' یعنی عقل سے محروم کر دے اور رفتہ رفتہ ساری نوع بشر کو انسانیت کے درجے سے گرا دے۔اس کی آرزو ہے کہ تہذیب و تمدن کا خاتمہ کر کے انسانی روحوں کو اپنا غلام بنا کر خدا کے سامنے لے جائیں اور کہے:''دیکھ تو نے دنیا کو پیدا کیا تھا' میں نے برباد کر دیا تو نے انسان کو عقل دی تھی' میں نے عیش و عشرت کا طلسم دکھا کر اس سے چھین لی۔'' لیکن ہزار ہا سال کوشش کرنے پر بھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔وہ اپنے زعم میں انسان کو اس لیے ابھارتا ہے کہ سیلاب فنا میں بہا لے جائے مگر انسان تھوڑے دن اس سیلاب کے ساتھ بہتا ہے اور آخر میں اسی کی قوت سے فائدہ اٹھا کر ساحل پر

---

1 گوئٹے کا Mepohisto ابلیس نہیں ہے بلکہ اس کا نائب جو اس کی طرف سے انسانوں کو بہکانے کی خدمت پر مامور ہے' ابلیس سے تمیز کرنے کے لیے ہم اسے شیطان کہیں گے۔

آ لگتا ہے۔ بہر حال اسے تو اپنی سی کوشش کرنا ہے۔ انجام چاہے جو کچھ ہو۔ فاؤسٹ کے معاملے میں اسے پورا یقین ہے کہ وہ اس کے انتہائی بعد اس کے بے پایاں حوصلے کا رخ جسمانی لذتوں کی طرف موڑ کر اس کی روح کو اپنے قبضے میں کر لے گا۔

اس وقت وہ جادو کے قوانین کے مطابق فاؤسٹ کا قیدی ہے۔ مطالعے کے کمرے کے دروازے پر ایک کامل مخمس کی شکل بنی ہوئی ہے جس میں سے وہ کتا بن کر آیا تھا' اس نے مخمس کو نہیں دیکھا اور جست کر کے اندر چلا آیا لیکن اب اس کی نظر اس نقش پر پڑ گئی ہے اور جان بوجھ کر وہ ضابطہ سحر کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ فاؤسٹ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اس وقت اس کے قابو میں ہے تو وہ اجازت دینے سے انکار کرتا ہے "جو شیطان کو پکڑ پائے اسے اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہیے۔" مگر شیطان مکر و فریب کا استاد ہے۔ فاؤسٹ کو جادو کا تماشا دکھانے کے بہانے اپنی ماتحت روحوں کو بلاتا ہے' جو ایک دلفریب گیت سنا کر فاؤسٹ کو مئے نغمہ کے نشے میں مدہوش کر دیتی ہے۔ شیطان اسے خواب غفلت میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ "فاؤسٹ تو کتنا ہی کچھ ہو مگر وہ انسان نہیں جو شیطان کو جکڑ کر رکھ سکے۔" وہ چوہوں کو بلاتا ہے جو مخمس کا ایک کونا کتر ڈالتے ہیں اور وہ نکل کر چلا جاتا ہے۔

دوسری بار شیطان ایک رئیس زادے کے بھیس میں آتا ہے وہ فاؤسٹ کو دعوت دیتا ہے کہ اس کے ساتھ عہد رفاقت کر لے اور چل کر دنیا کی سیر کرے اور زندگی کے عیش و عشرت کا لطف اٹھائے مگر فاؤسٹ کی زیست بیزاری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس کے دل کی آگ اس کی ہڈیوں تک کو پھونکے ڈالتی ہے۔ وہ آتش نوائی پر مجبور ہے۔ چاہے ساری زندگی ساری دنیا جل کر خاکستر ہو جائے وہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے۔ "لعنت ہو ان بلند خیالات پر جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے' لعنت ہو مظاہر کی نظر بندی پر جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے۔ لعنت ہو شہرت اور بقائے دوام کے فریب پر جو ہمیں خواب میں خوشامد کی لوری دیتے ہیں' لعنت ہو مال و حشم پر جو ہمیں منچلے پن کے کاموں پر ابھارتا ہے یا عیش عشرت میں مدہوش کر دیتا ہے' لعنت ہو انگور کے آب حیات پر' لعنت ہو محبت کے راز و نیاز پر' لعنت ہو امید پر' لعنت ہو عقیدے پر اور سب سے بڑھ کر لعنت ہو صبر پر۔"

"افسوس! صد افسوس!

تو نے مسمار کر دیا
خوبصورت دنیا کو
اپنے زبردست گھونسے سے

....

اے زمین کے سورما بیٹے
اسے نئی شان سے تعمیر کر
اپنے سینے میں، اپنے دل میں
اس کی پھر سے بنیاد رکھ
زندگی کا ایک نیا دور
روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں۔"

خدا جانے اس گیت میں کیا تاثیر ہے کہ فاؤسٹ کا ڈوبا ہوا دل لجہ ہلاکت کی گہرائی سے پھر اچھلتا ہے۔ اس کی رگوں میں زندگی کا سوکھا ہوا خون دوبارہ گردش کرنے لگتا ہے۔
یہ روحیں جنہوں نے یہ اعجاز مسیحائی دکھایا، کون ہیں؟ یہ شیطانی روحیں ہیں جنہوں نے شیطان کے حکم سے فاؤسٹ کا دل موت سے زندگی کی طرف پھیرا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ روحیں اور خود شیطان روح ارض کے آلہ کار ہیں۔ یہ اپنے زعم میں انکار اور نفی، ہلاکت اور تباہی کے علم بردار ہیں لیکن تقدیر الٰہی ان پر ہنستی ہے اور ان سے اپنا کام لیتی ہے۔ یہ اس پر مجبور ہیں کہ فاؤسٹ کو قعر عدم میں گرنے سے روکیں۔ یہ چاہتی ہیں کہ اسے حرمان و یاس سے برباد نہ ہونے دیں بلکہ عیش و عشرت سے ہلاک کریں۔ ان کی پہلی خواہش تو پوری ہو گئی، اب دیکھنا ہے دوسری بھی پوری ہوتی ہے یا نہیں۔

ابھی تو فاؤسٹ کو ان روحوں نے صرف مرنے سے روکا ہے، تڑپنے سے نہیں۔ وہ زندگی ہے مگر نیم بسمل۔ اس کا اضطراب قلب کم نہیں ہوا بلکہ اور بڑھ گیا۔ وہ شیطان کی دعوت قبول کرتا ہے اور اس کے حسب خواہش معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہے لیکن دنیا کی سیر اور زندگی کے مشاہدے

میں اسے راحت و مسرت کی تلاش نہیں بلکہ درد والم کی جستجو ہے۔ وہ زندگی کے بلند سے بلند اور پست سے پست جلوے کا مشاہدہ کرنا اور نوع انسانی کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہے تا کہ اس کا انفرادی نفس وسعت پا کر نوعی نفس بن جائے اور آخر ایک دن اپنی نوع کے ساتھ فنا ہو جائے۔"

شیطان اس کی اس خواہش کو شیخ چلی کا منصوبہ سمجھ کر اس پر ہنستا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انفرادی نفس کا اتنی وسعت پانا کہ وہ "کائنات اصغر" بن جائے ناممکن ہے۔

بہر حال اس کا اور فاؤسٹ کا معاہدہ ہوتا ہے اور فاؤسٹ خون کے حرفوں میں اس پر دستخط کرتا ہے۔ شیطان اقرار کرتا ہے کہ "زندگی کے سفر میں رفیق بلکہ غلام کی حیثیت سے فاؤسٹ کے ساتھ رہے گا۔" وہ اس دنیا میں فاؤسٹ کی خدمت کا بیڑا اٹھاتا ہے' اس کی پلکوں کے اشارے پر کام کرنے کا وعدہ کرتا ہے بشرطیکہ فاؤسٹ دوسری دنیا میں اس کے ساتھ یہی کرے۔ فاؤسٹ اس پر راضی ہے مگر وہ معاہدے کے الفاظ کو زیادہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ "اگر تو کبھی بہلا پھسلا کر مجھے میری زندگی سے مطمئن کر دے اور عیش و عشرت سے دھوکا دے دے...... اگر میں کسی لمحے کو مخاطب کر کے یہ کہہ دوں: ذرا ٹھہر جا تو کتنا حسین ہے' تب تجھے اختیار ہے کہ تو مجھے طوق و سلاسل میں جکڑ کر قعر مذلت میں ڈھکیل دے' تب میری موت کا گھنٹہ بجے' تب گھڑی رک جائے' سوئی گر جائے' تب میرے لیے وقت کا خاتمہ ہے" یعنی اگر دنیا کی لذتیں فاؤسٹ کے دل کو لبھالیں تو اس کی روح پر شیطان کا قبضہ ہو جائے گا۔

شیطان فاؤسٹ سے اصرار کرتا ہے کہ فوراً سفر کے لیے تیار ہو جائے' اتنے میں ایک طالب علم جو یونیورسٹی میں نیا نیا داخل ہوا ہے' فاؤسٹ سے ملنے آتا ہے۔ فاؤسٹ چاہتا ہے کہ اس سے ملنے سے انکار کر دے لیکن شیطان کی تجویز ہے کہ جتنی دیر فاؤسٹ سفر کی تیاری کرے وہ خود فاؤسٹ بن کر طالب علم سے گفتگو کرے۔ فاؤسٹ راضی ہو جاتا ہے اور سفری کپڑے پہننے کے لیے چلا جاتا ہے۔

شیطان اور طالب علم کی گفتگو میں گوئٹے نے شیطان کی زبانی اپنے زمانے کی جرمن یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں پر بلکہ اصل میں نوع انسانی کی علمی جدوجہد پر طنز آمیز تنقید کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر واقعی زندگی سے بے تعلق ہو گیا ہے۔ وہ بے جان چیزوں کی تحلیل کر سکتا ہے' جیتی جاگتی چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ "نظری علوم خشک

اور بے رنگ ہیں اور عملی زندگی ایک ہرا بھرا درخت۔" طالب علم شیطان کی تنقید کے اصل مفہوم کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہ تو بس اتنا سمجھتا ہے کہ یہ شفیق استاد اسے طلب علم کی زحمت و مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور لطف زندگی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شیطان کا مشورہ کہ طب پڑھنا چاہیے کیونکہ اس میں عیاشی کا خوب موقع ملتا ہے، طالب علم کو بہت پسند آتا ہے وہ (مصنوعی) پروفیسر فاؤسٹ سے درخواست کرتا ہے کہ اس کی خاندانی بیاض پر کوئی مقولہ لکھ دے جسے وہ زندگی میں اپنا دستور العمل بنا سکے۔ شیطان یہ الفاظ لکھتا ہے:

"تم دیوتاؤں کی طرح نیکی و بدی دونوں کا علم حاصل کرو"

طالب علم خوش خوش اپنے گھر جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد شیطان کہتا ہے "بس اس مقولہ پر عمل کر اور میری خالہ ناگن[1] کے پیچھے چل۔ ایک دن تیرے شبیہ ایزدی ہونے کی حقیقت کھل جائے گی۔"

وہ جانتا ہے کہ اسے ایک نیا شکار مل گیا۔ اب شیطان، فاؤسٹ کو ایک طلسمی چوغہ پہناتا ہے اور آگ جلا کر بخارات پیدا کرتا ہے جو دونوں کو اڑا کر دوش ہوا پر لے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کا سین لائپزش میں ہے۔ آؤ ایرباخ کے مشہور شراب خانے میں یاران بے تکلف جمع ہیں۔ شراب کا دور چل رہا ہے اور آپس میں بازاری مذاق ہو رہا ہے۔ شیطان فاؤسٹ کو لے کر وہاں پہنچتا ہے تاکہ ان لوگوں کی صحبت میں اس کا جی بہلائے۔ وہ ان لوگوں کو جادو کی آتشیں شراب پلاتا ہے، شراب کے چند قطرے زمین پر گرتے ہیں اور شعلہ بن کر بھڑکتے ہیں۔ شرابیوں پر غصہ اور خوف طاری ہوتا ہے اور وہ شیطان سے اس مذاق کا انتقام لینا چاہتے ہیں، شیطان ایسا جادو کر دیتا ہے کہ شراب خانہ انہیں انگور کا باغ نظر آتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی ناک کو انگور کا خوشہ سمجھ کر چاقو سے کاٹتے ہیں۔ اس عرصے میں شیطان فاؤسٹ کو لے کر چل دیتا ہے، طلسم کا اثر زائل ہونے کے بعد لوگ اپنی حالت دیکھتے ہیں اور غصے سے بوٹیاں چباتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سین تہذیب کی شان سے گرا ہوا ہے اور قصے میں بھی نہیں کھپتا۔ گوئٹے کا فاؤسٹ ایسا بدمذاق نہیں کہ اس بازاری صحبت میں اس کا دل بہلے اور نہ شیطان اتنا بے وقوف ہے کہ وہ اس قسم کی خفیف الحرکاتی سے فاؤسٹ کو پرچانے کی کوشش کرے۔ اصل میں یہ فاؤسٹ

1 سانپ کی طرف اشارہ ہے، جس کی بدولت حضرت آدم بہشت سے نکلے۔

کے پرانے قصے کا ایک حصہ ہے جسے گوئٹے نے بھی لے لیا ہے۔ ابتدائی مسودے میں اس نے خود فاؤسٹ کو ان لغو حرکتوں کا فاعل قرار دیا ہے مگر بعد میں اسے احساس ہوا کہ یہ باتیں فاؤسٹ کی سیرت سے مناسبت نہیں رکھتیں، اس لیے اس نے اتنی تبدیلی کر دی کہ بانی کار 'شیطان' کو رکھا اور فاؤسٹ کو محض تماشائی، جو اس سارے کھیل سے بیزار ہے۔ اس سین کو گوئٹے نے غالباً دو وجوہ سے قائم رکھا: ایک یہ کہ وہ اس پردے میں اپنی لائپزش کی زندگی کے تلخ تاثرات بیان کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ تھیٹر کے ان تماشائیوں کو خوش کرنا چاہتا تھا جو نظر فریب مناظر دیکھنے کے شائق ہیں۔

اس کے بعد فاؤسٹ اور شیطان "جادوگرنی کے باورچی خانے" میں نظر آتے ہیں۔ اس سین میں گوئٹے نے جادو کے سفلی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ایک زمانے میں وہ سحر و نیرنجات کا قائل تھا مگر بہت جلد اس خام خیالی سے نجات پا گیا۔ یہاں وہ دکھانا چاہتا ہے کہ جادو کے شوق کی بدولت انسان کے ادنا جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ بدمذاقی اور نجاست کے ان گڑھوں میں گرتا ہے جنھیں شیطان بھی اپنی شان سے پست سمجھتا ہے۔ ناٹک کے قصے میں اس سین کی اہمیت یہ ہے کہ فاؤسٹ کی عمر زیادہ ہونے سے جو دقت پیدا ہوئی تھی وہ دور ہو جاتی ہے۔ فاؤسٹ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اس لیے وہ عیش و عشرت کی زندگی کا پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔ آنے والے عشق و عاشقی کے معاملات کو واقعیت کا رنگ دینے کے لیے فاؤسٹ کو نئے سرے سے جوان کرنا ضروری ہے۔ یہ ممکن تھا کہ شاعر، شیطان ہی کی مدد سے فاؤسٹ کو جوانی بخش دیتا لیکن جادوگرنی کا واسطہ پیدا کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ جادو کی ذلت اور پستی دکھانے کا موقع ہاتھ آئے۔

فاؤسٹ، شیطان کے ساتھ جادوگرنی کے باورچی خانے میں آتا ہے جہاں بوڑھوں کو جوان بنانے کے لیے ماء اللحم تیار ہوتا ہے۔ فاؤسٹ کو اس ناپاک مکان میں قدم رکھتے گھن آتی ہے وہ چاہتا ہے کہ شیطان جوانی حاصل کرنے کی کوئی دوسری تدبیر بتائے کہ شیطان کہتا ہے! دوسری تدبیر یہ ہے کہ انسان کسانوں کی سادہ اور صحت بخش زندگی اختیار کرے۔ وہ جانتا ہے کہ فاؤسٹ کی سی طبیعت کا آدمی اس پر کبھی راضی نہ ہوگا اور وہ واقعی فاؤسٹ باوجود انتہائی کراہت کے وہاں ٹھہر کر جادوگرنی کا انتظار کرتا ہے۔ وہاں جادو کے آئینے میں اسے ایک عورت کی شکل نظر آتی ہے جس پر وہ ہزار جان سے عاشق ہو جاتا ہے۔ اس آئینے میں یہ صفت ہے کہ ہر شخص کو اس میں اپنے حسن کا نصب العین مجسم نظر آتا ہے۔ شارحوں میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ فاؤسٹ

نے یہاں جو تصویر دیکھی وہ گریٹشن کی ہے جس پر وہ آگے چل کر عاشق ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں نہیں یہ ہیلن کی صورت ہے جسے فاؤسٹ (دوسرے حصے میں) عالم مثال میں بلاتا ہے اور اس سے شادی کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں فاؤسٹ اس "ابدی جوہر انوثیت" کا عکس رخ دیکھتا ہے جو گوئٹے کے فلسفہ عشق کی جان ہے۔ یہی عکس اسے گریٹشن کے حسن المانی میں بھی نظر آیا اور ہیلن کے جمال یونانی میں بھی۔ اس لیے دونوں میں سے کسی کے ساتھ اس کی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ "ابدی جوہر انوثیت" کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ گوئٹے کے نزدیک کائنات میں ایک ابدی حسین جوہر کارفرما ہے جو انسان کو پست مادی زندگی سے بلند روحانی حیات سرمدی کی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کی جھلک عاشق صادق کو اپنی معشوقہ کے حسن میں نظر آتی ہے اور اگر انسان کی زندگی شہوانی لذات میں پھنس کر نہ رہ جائے تو اس مجازی عشق کے زینے سے وہ بام حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ غرض جادوگرنی آتی ہے اور فاؤسٹ کو عرق شباب پلاتی ہے۔ فاؤسٹ اور شیطان رخصت ہو جاتے ہیں۔

آئندہ سین میں فاؤسٹ جوان نظر آتا ہے۔ ایک دلربا دوشیزہ گریٹشن گرجے سے لوٹ کر اپنے گھر جارہی ہے۔ فاؤسٹ اسے راہ میں دیکھتا ہے' اسے اس لڑکی کے بھولے بھالے چہرے میں اپنے پیکر خیالی کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس کے دام الفت میں اسیر ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ گریٹشن سے گفتگو چھیڑے لیکن وہ عصمت مآب اسے جھڑک کر چلی جاتی ہے۔ فاؤسٹ' شیطان سے اپنی محبت اور بے قراری کا حال کہتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے کہ جلد سے جلد اس لڑکی سے ملاقات کی صورت نکالے۔ شیطان کہتا ہے کہ وہ لڑکی اب تک خلش آرزو سے بیگانہ ہے۔ اس لیے اسے قابو میں لانا سہل نہیں۔ آخر جب فاؤسٹ کا اصرار حد سے گزر جاتا ہے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ کوئی تدبیر کرے گا۔ فاؤسٹ اس شرط پر کچھ دن صبر کرنے کے لیے تیار ہے کہ شیطان اس عرصے میں اسے اس کی محبوبہ کی خواب گاہ کی زیارت کرادے اور اس کے لیے کوئی قیمتی تحفہ لا دے۔

شام کو شیطان' فاؤسٹ کو گریٹشن کی خواب گاہ میں لے جاتا ہے۔ فاؤسٹ کچھ عرق شباب کے اثر سے اور کچھ شیطان کی صحبت کی بدولت شہوانی خواہشات سے مغلوب ہے لیکن گریٹشن کی خوابگاہ کی معصومانہ فضا میں اس کے لطیف جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی محبوبہ کی پاک اور

بھولی گھریلو زندگی کے تصور کے مزے لیتا ہے۔ گریٹشن کے قدموں کی آہٹ سن کر دونوں اس کی الماری میں ایک زیور کا صندوقچہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ گریٹشن داخل ہوتی ہے اور الماری میں زیور دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ اپنی ہمسائی مارتھے کے گھر جاتی ہے اور زیور پہن کر اسے دکھاتی ہے۔ شیطان بھی ایک مسافر کی صورت بنا کر وہاں پہنچتا ہے اور مارتھے کو اس کے شوہر کے مرنے کی جھوٹی خبر سناتا ہے۔ مارتھے یہ خبر سن کر دل میں بہت خوش ہوتی ہے مگر جھوٹ موٹ کے آنسو بہاتی ہے۔ شیطان اس عورت کے چہرے سے بھانپ لیتا ہے کہ یہ کٹناپے کے لیے بہت موزوں ہے اور اس کے ذریعے سے گریٹشن بہکائی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی خبر کی تصدیق کے بہانے دوسرے دن فاؤسٹ کو ہمراہ لانے کی اجازت لے کر چلا جاتا ہے۔ چلتے چلتے گریٹشن سے اصرار کرتا ہے کہ وہ بھی اس موقع پر موجود رہے۔

گریٹشن کے کیرکٹر میں گوئٹے نے جرمن عورت کی روح کا دلکش مرقع دکھایا ہے۔ اسے حسن ظاہری میں بہت کم حصہ ملا ہے لیکن اس کی روحانی خوبیوں کا رنگ اس کے چہرے پر جھلکتا ہے اور ارباب نظر کے دل کو کھینچتا ہے۔ وہ سادگی اور نیکی، عقیدت اور دین داری، محبت اور خدمت، سوز اور درد، صبر اور تحمل کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور ''ابدی جوہر انوثیت'' کی سچی مظہر۔ وہ اپنے نسوانی وجدان کی بدولت بے جانے بوجھے شیطان سے کراہت رکھتی ہے اور شیطان کو بھی خود بخود اس سے وحشت ہوتی ہے۔ شیطان فاؤسٹ کو مادیت، لذت پرستی، سرکشی، انکار اور ہلاکت کی طرف کھینچتا ہے اور گریٹشن اسے روحانیت عبودیت ایمان اور بقائے ابدی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔

دوسرے دن مارتھے کے گھر پر عاشق و معشوق ملتے ہیں۔ ایک طرف مارتھے، ابلیس پر بوڑھے غمزوں کا جال ڈال رہی ہے اور دوسری طرف فاؤسٹ اور گریٹشن میں پیمان وفا باندھا جا رہا ہے۔ انہیں باتوں میں وقت گزرتا ہے۔ رات گئے مارتھے، جسے ''نقصان مایہ'' سے زیادہ ''شماتت ہم سایہ'' کا خوف ہے فاؤسٹ اور شیطان سے اصرار کرتی ہے کہ وہ اب رخصت ہو جائیں ورنہ محلے کے لوگوں کو بدگمانی کا موقع ملے گا۔

فاؤسٹ کا خار محبت کی خلش چین نہیں لینے دیتی ہے۔ وحشت دل اسے کھینچ کر صحرا میں لے جاتی ہے۔ یہاں وہ روح ارض کے فیض سے فطرت کے حسن پنہاں کا مشاہدہ کرتا ہے اور درختوں

کے سبز پتوں میں معرفت کردگار کے دفتر دیکھتا ہے۔" حیرت کی سرد مہری سے نہیں بلکہ ایسی گرم جوشی سے جیسے کوئی اپنے دوست کے قلب کی گہرائیوں میں نظر ڈالتا ہے۔" اس سعادت بخش تنہائی میں شاید اسے سکون قلب حاصل ہوتا لیکن شیطان آتا ہے اور روح ارض کی بخشی ہوئی نعمتوں کو "ایک لفظ میں ایک سانس میں معدوم کر دیتا ہے۔' وہ فاؤسٹ کے دل میں گریٹشن کی محبت کی آگ جو بجھی نہیں مگر کجلا گئی ہے پھر بھڑکا دیتا ہے۔ اب فاؤسٹ عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کا دل عشق کے پاک جذبے اور شہوانی لذت کی ناپاک خواہش کی رزم گاہ بن گیا ہے۔ آرزو اسے لذت کی طرف کھینچتی ہے اور لذت میں اس کا دل آرزو کے لیے تڑپتا ہے۔

اس حالت میں ایک روز شیطان آتا ہے اور گریٹشن کا حال زار سناتا ہے۔ وہ فاؤسٹ کی محبت میں طائر رشتہ بر پا کی طرح تڑپ رہی ہے اور دن رات اس کی راہ دیکھا کرتی ہے۔ شیطان کا اصرار ہے کہ فاؤسٹ بستی میں چل کر غریب گریٹشن کو "اس کی محبت کا انعام دے۔" فاؤسٹ اس شیطانی ترغیب سے بچنے کے لیے بہت کچھ ہاتھ پیر مارتا ہے مگر کچھ بن نہیں پڑتی۔ آخر وہ بستی میں جا کر گریٹشن سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔

مارتھے کے پائیں باغ میں فاؤسٹ اور گریٹشن دوبارہ ملتے ہیں اور معشوقہ اپنے عاشق کو درد ہجر کی داستان سناتی ہے۔ وہ دل و جان سے فاؤسٹ پر فدا ہے مگر ایک تو اسے فاؤسٹ کی دین داری کی طرف سے اطمینان نہیں۔ دوسرے وہ اس کے ساتھی سے ڈرتی ہے اور نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنے دل کی الجھن دور کرنے کے لیے فاؤسٹ سے سوال کرتی ہے کہ اسے خدا پر عقیدہ ہے یا نہیں۔ فاؤسٹ کا جواب گوئٹے کے مذہبی عقائد کا آئینہ ہے۔ "کس میں یہ تاب ہے کہ خدا کا نام لے اور اس پر ایمان نہ لائے! تو پوچھتی ہے کہ میں اسے مانتا ہوں یا نہیں؟ کس احساس رکھنے والے دل کی مجال ہے کہ کہے میں اسے نہیں مانتا' وہ محیط کل! وہ قادر مطلق! کیا اس کی قدرت' اس کی ذات مجھے تجھے اور خود اسے محیط نہیں؟ کیا اوپر آسمان کا گنبد نہیں؟ کیا نیچے زمین کا فرش نہیں؟ کیا ابدی ستارے محبت کی نظریں برساتے سیر میں مصروف نہیں؟ کیا میں تجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا تیرے دل و دماغ میں وجود محض بسا ہوا نہیں؟ کیا تیری آنکھوں میں راز آشکارا چھپایا ہوا نہیں؟ اس وسعت نامحدود سے اپنے دل کو معمور کر لے اور جب اس واردات سے تجھ پر وجد طاری ہو جائے تو اس کا جو نام چاہے رکھ لے: سعادت' دل' عشق یا

خدا۔ میرے پاس اس کے لیے کوئی نام نہیں۔ جو کچھ ہے وجدان ہے نام ایک آواز ہے' ایک دھواں ہے جو کہر بن کر آسمانی نور کو چھپالیتا ہے۔"

گریٹشن کو اس جواب سے ایک حد تک اطمینان ہو جاتا ہے مگر اس کے دوسرے شبے کو دور کرنے میں فاؤسٹ کامیاب نہیں ہوتا۔ اسے شیطان سے روحانی نفرت یا بقول فاؤسٹ کے للہی بغض ہے "جیسے ہی وہ دروازے میں قدم رکھتا ہے حقارت کی ہنسی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا ہے اور کچھ بیزار سا نظر آتا ہے' صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی چیز سے لگاؤ نہیں۔ اس کے ماتھے پر لکھا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اسے نہیں بھاتا...... اس کے ہوتے مجھ سے دعا بھی نہیں مانگی جاتی۔ اس سے میرے دل میں ناسور سا پڑ گیا۔" فاؤسٹ یہ تمنا ظاہر کرتا ہے کہ گریٹشن کو آغوش میں لے کر گھڑی بھر جسمانی اور روحانی وصل کا لطف اٹھائے۔ بھولی لڑکی اسے رات کو اپنے گھر بلانے پر تیار ہے مگر اپنی ماں کی موجودگی کے سبب سے معذوری ظاہر کرتی ہے۔ فاؤسٹ اسے بے ہوشی کی دوا (جو غالباً شیطان کا تحفہ ہے) دیتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ رات کو سوتے وقت اپنی ماں کو پلا دے۔ وہ گریٹشن کو یقین دلاتا ہے کہ اس میں کسی نقصان کا خطرہ نہیں۔

بدنصیب گریٹشن اپنے دلدار کی خواہش کو پورا کرتی ہے۔ وہ اتنی معصوم ہے کہ اسے اس کے نتائج کی خبر نہیں۔ اتفاق سے وہ اپنی ایک سہیلی سے کسی دوسری سہیلی کی تباہی کا حال سنتی ہے۔ اب اس پر یہ بات کھلتی ہے کہ ایک گھڑی بھر کی لغزش سے بیچاری لڑکیوں کی ساری زندگی عذاب میں پڑ جاتی ہے۔ ادھر تو وہ اس خیال سے سہم جاتی ہے اور ادھر اس کی ماں بے ہوشی کی دوا کے اثر سے گزر جاتی ہے۔ غریب گریٹشن احساس گناہ اور ماں کے صدمے سے بدحواس کنواری مریم کے طاق میں پھول رکھنے جاتی ہے اور اس "درد بھری دکھیاری بی بی" کو اپنا درد دل سناتی ہے۔

اس عرصے میں اس کے بھائی والنٹین کو جو فوج میں نوکر ہے اپنی ماں کی موت اور اپنی بہن کی "آوارگی" کی خبر پہنچتی ہے۔ وہ سیدھا سادہ سپاہی جو عزت کو جان سے بڑھ کر سمجھتا ہے یہ سن کر اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ اس کے قلب میں اتنی وسعت اور اس کی نظر میں اتنی گہرائی نہیں کہ عارضی لغزش اور بدچلنی میں فرق کرے اور اپنی بدنصیب بہن پر قہر توڑنے کی جگہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو تسکین دے۔ پھر اس کے دوست اور اس کے کان بھرتے ہیں۔ وہ اپنی بہن کو سزا دینے اور اس کے عاشق سے انتقام لینے کے قصد سے وطن کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ تقدیر کی کرشمہ

سازی دیکھئے کہ جب وہ رات کے وقت اپنے گھر کے پاس پہنچتا ہے تو فاؤسٹ سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے جو شیطان کو ساتھ لیے گریٹشن سے ملنے کی فکر میں کھڑا ہے۔ والنٹین اور فاؤسٹ میں تلوار چلتی ہے اور شیطان فاؤسٹ کی مدد کرتا ہے۔ والنٹین زخمی ہو کر گرتا ہے۔ محلے کے لوگ ان لڑنے والوں کی آوازیں سن کر دوڑ پڑتے ہیں۔ شیطان' فاؤسٹ کو لے کر بھاگ جاتا ہے۔ والنٹین کے گرد ایک مجمع اکٹھا ہے۔ گریٹشن بھی شور وغل کی آواز سن کر باہر آتی ہے اور اپنے بھائی کو خاک وخون میں تڑپتا دیکھ کر چیخ اٹھتی ہے۔ والنٹین سب کے سامنے گریٹشن کے واقعی اور فرضی گناہوں کا اعلان کرتا ہے اور اسے بددعائیں دیتے دیتے دم توڑ دیتا ہے۔

اب گریٹشن کی جو حالت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ عاشق سے چھوٹنے کا قلق' ماں اور بھائی کے مرنے کا صدمہ' بدنامی کی شرم اور سب سے بڑھ کر گناہوں کی ندامت۔ ان چیزوں سے اس کے دل پر مایوسی اور اس کے دماغ پر جنون کا تسلط ہو گیا ہے۔ اسی حالت میں اس کے لڑکا ہوتا ہے جسے وہ تالاب میں غرق کر دیتی ہے۔ اس جرم میں وہ قید کر دی جاتی ہے اور سزائے موت کے انتظار میں زندگی کی گھڑیاں گزارتی ہے۔

فاؤسٹ مفرور ہے۔ اسے ان واقعات کی خبر نہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ عیش وعشرت کے دلفریب مناظر دکھا کر گریٹشن کے خیال کو اس کے دل سے نکال دے اور اس کی روح کو اپنے قابو میں لے آئے۔ وہ اسے والپرگس کی رات کا جشن[1] دکھانے کے لیے جاتا ہے۔

شیطان کا خیال ہے کہ شیطانی لذتوں کے ہیجان وتلاطم میں فاؤسٹ کی عقل معطل ہو جائے گی' اس کی روح میں عالم بالا کی طرف پرواز کرنے کی طاقت نہ رہے گی اور وہ مادی زندگی پر قناعت کر کے معاہدے کے مطابق شیطان کا مرید ہو جائے گا۔ اس لیے شیطان اسے عام مجمع سے ہٹا کر اپنے خاص حلقے میں لے جاتا ہے وہاں جا کر فاؤسٹ میں تاب مقاومت گھٹنے لگتی ہے او وہ جادوگرنیوں کے مجنونانہ رقص میں شریک ہو جاتا ہے لیکن دفعتاً یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ ادھر اس کے ساتھ ناچنے والی چڑیل کے منہ سے ایک سرخ چوہیا نکلتی ہے جس سے فاؤسٹ کے دل میں سخت کراہت پیدا ہوتی ہے۔ ادھر اسے دور سے گریٹشن کا پیکر خیالی نظر آتا ہے اور اس کے دل میں

---

1. یہ جشن جرمن کہانیوں کے مطابق یکم مئی کی شب کو بروکن پہاڑ پر ہوتا ہے۔ اس میں ساری چڑیلیں اور جادوگرنیاں ابلیس کے دربار میں جمع ہوتی ہیں اور عیش پرستی کی داد دی جاتی ہے۔

"ابدی جوہر انوثیت" کی سوئی ہوئی آرزو کو بیدار کر دیتا ہے۔ سچے عشق کے چھینٹے سے شہوانی عشق کا نشہ اتر جاتا ہے اور فاؤسٹ کی روح شیطان کے دام فریب سے تڑپ کر نکل جاتی ہے۔
اس کے بعد گوئٹے شیطان کے سردار ابلیس کے دربار کا منظر دکھانا چاہتا تھا جہاں فاؤسٹ کو مادی لذتوں کے سیلاب سے آخری مقابلہ کرنا پڑتا لیکن اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے اس نے روحوں کے تھیٹر کا سماں باندھا جس میں اپنے عہد کے ادیبوں، نقادوں اور فلسفیوں پر طنز آمیز تنقید کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ سین بھی قصے میں کسی طرح نہیں کھپتا مگر یہ تو گوئٹے کے آرٹ کی عام کمزوری ہے کہ جن خیالات سے کسی خاص زمانے میں اس کا دل متاثر ہوتا ہے انہیں وہ بغیر ترتیب اور تسلسل کا خیال کیے اپنی تصنیف میں خواہ مخواہ ٹھونس دیتا ہے۔

والپرگس کی رات کا خمار دور ہونے کے بعد فاؤسٹ کو گریٹشن کی یاد ستاتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ گریٹشن پر کیا مصیبتیں گزریں اور گزر رہی ہیں تو وہ اپنی بیوفائی اور تغافل پر بہت پچھتاتا ہے اور شیطان پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دیتا ہے کہ اس کی بدولت وہ اپنی معشوقہ کے حال سے بے خبر رہا۔ اس کے انتہائی اصرار کے بعد شیطان اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اسے گریٹشن کے قید خانے میں لے جائے گا اور اس کی رہائی میں مدد دے گا۔

قید خانے کا منظر فاؤسٹ کے پہلے حصے کا آخری سین ہے۔ شیطان محافظوں کو بے ہوش کر دیتا ہے اور فاؤسٹ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ گریٹشن جنون کی حالت میں فاؤسٹ کو جلاد سمجھتی ہے لیکن فاؤسٹ کے بار بار سمجھانے کے بعد وہ اسے پہچانتی ہے۔ اس کی حالت اور اس کی گفتگو دھوپ چھاؤں کا عجیب حسین اور دلگداز منظر ہے۔ اس کے دماغ پر جنون کی تاریکی چھائی ہوئی ہے جس میں کبھی کبھی عقل کی روشنی چمک اٹھتی ہے مگر دیوانگی اور ہوشیاری دونوں کی لوح پر گریٹشن کی بھولی نیک اور سراپا درد سیرت کا نقش نہایت دلکش ہے۔ گفتگو کے آخری حصے سے اس کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فاؤسٹ: اگر تجھے یہ احساس ہے کہ میں ہی تیرا چاہنے والا ہوں تو میرے ساتھ چلی آ۔
مارگریٹے[1]: وہاں؟

---

1. گریٹشن کا پورا نام مارگریٹے ہے، گریٹشن پیار کا نام ہے جیسے ہم زیب النساء سے زیبن اور نجم النساء سے نجمن بنا لیتے ہیں۔

فاؤسٹ: آزادی کی کھلی ہوا میں۔

مارگریٹ: اگر وہاں قبر ہے اور موت میری راہ دیکھ رہی ہے تو چلتی ہوں! یہاں سے ابدی خواب گاہ میں مگر وہاں سے آگے ایک قدم بھی نہیں۔ کیا تو جاتا ہے؟ ہائے! کاش میں تیرے ساتھ چل سکتی!

فاؤسٹ: چل کیوں نہیں سکتی چلنے پر راضی تو ہو! دروازہ کھلا ہے۔

مارگریٹ: میری مجال نہیں کہ یہاں سے جاؤں۔ میری رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ بھاگنے سے کیا فائدہ؟ لوگ میری تاک میں ہیں۔ یہ کیا کم مصیبت ہوگی کہ بھیک مانگتی پھروں اور وہ بھی دل میں چور لیے ہوئے؟ یہ کیا کم مصیبت ہوگی کہ پردیس میں ٹھوکریں کھاتی پھروں؟ اور پھر ایک نہ ایک دن پکڑا جانا ضروری ہے۔

فاؤسٹ: تو پھر میں بھی تیرے پاس رہوں گا۔

مارگریٹ: جلدی جا جلدی جا! اپنے معصوم بچے کی جان بچا۔ دیر نہ کر۔ چشمے کے کنارے کنارے سیدھا چلا جا اور پل سے گزر کر جنگل میں بائیں طرف مڑ جا جہاں تالاب میں ایک تختہ رکھا ہے۔ دوڑ اسے تھام لے! دیکھ وہ ابھرا! ابھی تک ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ بچا لے! بچا لے!

فاؤسٹ: خدا کے لیے ہوش میں آ! بس جہاں ایک قدم اٹھایا پھر تو آزاد ہے۔

مارگریٹ: کاش ہم اس پہاڑ کے پاس سے جلد گزر جاتے! وہ دیکھ میری ماں ایک چٹان پر بیٹھی ہے۔ مجھے ڈر سے ٹھنڈا پسینا آتا ہے۔ میری ماں چٹان پر بیٹھی ہے اور اس کا سر ہل رہا ہے۔ وہ نہ بلاتی ہے نہ اشارہ کرتی ہے' اس کا سر بھاری ہے۔ وہ اتنی دیر سوئی کہ اب کبھی نہ جاگے گی اسے میں نے سلا دیا تھا کہ ہم بے کھٹکے ہم آغوشی کا لطف اٹھائیں' ہائے وہ بھی کیا اچھے دن تھے!

فاؤسٹ: نہ خوشامد سے کام چلتا ہے نہ سمجھانے سے۔ اب چاہے جو کچھ ہو میں تجھے زبردستی اٹھائے لیے چلتا ہوں۔

مارگریٹ: خبردار مجھے نہ ہاتھ لگانا! مجھے اس زبردستی کی برداشت نہیں! تو مجھے کیوں جلاد کی طرح گھسیٹتا ہے؟ کیا میں نے تیری نازبرداری نہیں کی؟

فاؤسٹ: دن نکلا چاہتا ہے! میری پیاری خدا کے لیے مان جا'

مارگریٹ: دن؟ ہاں دن ہونے والا ہے! آخری دن آ رہا ہے۔ یہ دن میری شادی کا تھا!

کسی سے یہ نہ کہنا کہ تو گریٹشن کے پاس تھا۔ہائے میرا اسہرا! جو ہونا تھا ہو گیا۔اب ہم پھر ملیں گے مگر ناچ میں نہیں۔لوگوں کا ہجوم ہے' سب خاموش ہیں۔گلیوں میں اور چوک میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔موت کا گھنٹہ بج رہا ہے۔بانس ٹوٹ گیا۔لوگ میری مشکیں کس رہے ہیں اور مجھے کھینچتے ہوئے قتل گاہ میں لے جا رہے ہیں۔جلاد کی تیز تلوار جو پہلے اور گردنوں پر چمکی تھی اب میری گردن پر چمک رہی ہے۔دنیا قبر کی طرح خاموش ہے۔

فاؤسٹ: آہ کاش میں کبھی پیدا نہ ہوتا!

شیطان: (دروازے کے باہر نظر آتا ہے) اٹھو! ورنہ تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ آخر یہ فضول حیص بیص کب تک یہ ششش و پنج یہ قیل وقال! میرے گھوڑے سردی میں کانپ رہے ہیں۔صبح کی روشنی نمودار ہے۔

مارگریٹے: یہ زمین کے اندر سے کون سی شکل ظاہر ہوئی؟ یہ وہی ہے! وہی ہے!! اسے یہاں سے نکال دے۔پاک زمین میں اس کا کیا کام؟ یہی میری روح چاہتا ہے!

فاؤسٹ: تو زندہ رہے گی!

مارگریٹے: اے داور حقیقی! میں اپنی روح تجھے سونپتی ہوں۔

ابلیس: چل! چل! ورنہ میں تجھے بھی اسی کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔

مارگریٹے: میں تیری ہوں اے آسمانی باپ! مجھے نجات دے! اے فرشتو! اے عالم قدس کے لشکرو! میرے گرد جمع ہو جاؤ اور میری حفاظت کرو۔ہائزش تجھے دیکھ کر میرا دل لرزتا ہے۔

شیطان: اب یہ نہیں بچتی!

عالم بالا کی صدا: بچ گئی۔

شیطان: (فاؤسٹ سے) آ میرے ساتھ (فاؤسٹ کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے)۔

قید خانے کے اندر سے آواز آ رہی ہے: ہائزش! ہائزش!

فاؤسٹ اور گریٹشن کا قصہ ختم ہو گیا۔گریٹشن کے نسوانی وجدان نے اس پر یہ راز کھول دیا تھا کہ فاؤسٹ کے ساتھ جانا گویا اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کرنا ہے۔اس نے ایسی رہائی پر موت کو ترجیح دی اور اپنے گناہوں کا کفارہ دے کر نجات ابدی حاصل کی۔اس وقت وہ فاؤسٹ کو نہیں بچا سکی لیکن اب وہ ایک روحانی شمع بن کر اس کو راہ دکھائے گی اور آگے بڑھاتی جائے گی'

یہاں تک کہ عالم حقیقت کے پراسرار پردوں میں دونوں نظر سے غائب ہو جائیں۔

یہاں پہلا حصہ ختم ہوتا ہے اور فاؤسٹ اور گریٹشن کا واقعی افسانہ بھی۔ اس قصے میں دونوں کی حیثیت معمولی انسانوں کی ہے' البتہ کہیں کہیں اس بات کی ذرا سی جھلک نظر آ جاتی ہے کہ فاؤسٹ نوع انسانی کا نمائندہ ہے اور گریٹشن ''ابدی جوہر انوثیت'' کی مظہر۔ دوسرے حصے میں رنگ بالکل بدل جاتا ہے۔ فاؤسٹ کی انفرادی حیثیت بالکل چھپ جاتی ہے' وہ جدید مغربی تمدن کے انسان کی مثال (ٹائپ) بن کر رہ جاتا ہے اور گریٹشن تو قید جسم سے آزاد ہو کر روح انوثیت میں جذب ہو ہی چکی ہے۔ مختصر یہ کہ دوسرا حصہ اول سے آخر تک ایک طویل استعارہ ہے' جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شک اور اضطراب اور مادی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان کس طرح ذوق جمال اور محبت بنی نوع کی منزلوں سے گزر کر عرفان و عقیدت کی سرحد میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کی زنجیریں خود بخود ٹوٹ کر گر جاتی ہیں۔

گوئٹے کی طبیعت میں شک بھی ہے اور یاس بھی لیکن امید ان سب چیزوں پر غالب ہے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ ''فاؤسٹ'' کے قدیم افسانے کی تقلید میں اپنے ہیرو کو شیطان سے مغلوب ہو جانے دے۔ اس کا فاؤسٹ جدید تمدن کا نمائندہ ہے۔ گوئٹے کو یقین ہے کہ عہد جدید کا انسان شدید کشمکش کے بعد ایک دن ضرور نجات پائے گا۔ اس نجات کی بنیاد اس نے گریٹشن کی شخصیت سے ڈال دی ہے۔ دوسرے حصے میں اس بنیاد پر ایک پوری عمارت کھڑی کر دیتا ہے۔

ہم نے صرف پہلے حصے کا ترجمہ کیا ہے' اس لیے دوسرے حصے کے مضامین تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک مختصر سا خاکہ محض اس غرض سے کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو پورا قصہ معلوم ہو جائے۔

فاؤسٹ کے جانے کے بعد گریٹشن سزائے موت پا کر قید حیات سے رہا ہو جاتی ہے۔ فاؤسٹ فراق کے صدمے سے تڑپتا ہے۔ دوسرے حصے کے پہلے سین میں وہ حسن فطرت کے نظارے میں محو نظر آتا ہے۔ مناظر قدرت کا سکون اس کے دل کے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔

لیکن وہ شیطان کا حلیف ہے' جو ذوق عمل اور آرزوے لذت کی روح ہے۔ شیطان کو گوارا نہیں کہ فاؤسٹ دم بھر چین سے بیٹھے۔ وہ اس کے دل میں قوت و اقتدار کا شوق ابھارتا ہے اور

اسے لے کر شہنشاہ کے دربار میں پہنچتا ہے۔ شیطان کے مشورے سے وہ سلطنت کی مالی مشکلات دور کرنے کے لیے کاغذ کا سکہ جاری کرتا ہے اور شہنشاہ کی تفریح طبع کے لیے نیرنجات کا تماشا دکھاتا ہے۔ شہنشاہ فاؤسٹ سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ قدیم یونان کی مشہور حسینہ ہیلن کی روح کو بلوائے۔ فاؤسٹ اس معاملے میں شیطان سے مدد چاہتا ہے مگر وہ معذوری ظاہر کرتا ہے۔ اس کی رائے میں اس مہم کے سرانجام کے لیے خود فاؤسٹ کو عالم مثال میں جانا پڑے گا۔ فاؤسٹ ہمت کر کے عالم مثال کا سفر اختیار کرتا ہے اور ''امہات'' کی دستگیری سے جو صور و اعیان کی تخلیق کرتی ہیں وہ ہیلن کی روح کو ساتھ لاتا ہے۔ شہنشاہ اور اس کے درباری ہیلن کے حسن کامل کی قدر دانی سے قاصر ہیں۔ ان پر اس کے نظارے سے کوئی اثر نہیں ہوتا مگر فاؤسٹ دل و جان سے ہیلن پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ وارفتگی کے عالم میں اس پیکر مثالی سے ہم آغوش ہونے کے لیے بڑھتا ہے کہ دفعتاً ایک دھماکے کی آواز آتی ہے۔ روحیں غائب ہو جاتی ہیں اور فاؤسٹ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ شیطان اسے کندھے پر لاد کر لے جاتا ہے اور اس کے پرانے مکان میں مطالعے کے کمرے میں پہنچا دیتا ہے۔

شیطان جانتا ہے کہ فاؤسٹ کو ہیلن کا وصال حاصل کرنے کے لیے ایک انسانی پتلے کی مدد کی ضرورت ہے۔ فاؤسٹ کا شاگرد واگنر جو اب ایک مشہور عالم ہے کیمیاوی ترکیب سے ایک ''انسانی پتلا'' بنانے میں مصروف ہے۔ شیطان، واگنر سے مل کر اس مصنوعی انسان کی تخلیق میں اس کی مدد کرتا ہے۔ چشم زدن میں ایک شیشے کے اندر ایک چھوٹا سا انسان پیدا ہوتا ہے اور شیطان اور واگنر سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ شیطان اس شیشے کو اٹھا کر فاؤسٹ کے پاس لاتا ہے جو اب تک بے ہوش پڑا ہے۔ ''انسانی پتلا'' اپنی مخفی بصیرت سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ فاؤسٹ اس وقت یونان کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فاؤسٹ کو بیدار کرنا مناسب نہیں بلکہ اسے اسی طرح اٹھا کر یونان لے چلنا چاہیے تا کہ جب اس کی آنکھ کھلے تو اپنے آپ کو اس ملک میں پائے جس کا وہ آرزومند ہے اور جہاں اسے ہیلن کا وصال حاصل ہو سکتا ہے۔ شیطان تھوڑی دیر انکار کرنے کے بعد ساتھ چلنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ واگنر بھی ساتھ جانا چاہتا ہے مگر وہ پتلا اسے ساتھ لے جانے سے انکار کرتا ہے اور اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ بدستور اپنی عملی تحقیق میں مصروف رہے۔

جیسا ہم کہہ چکے ہیں، اس تمثیل میں گوئٹے کو عہد جدید کے انسان کی ذہنی اور روحانی ارتقا

دکھانا منظور ہے۔ اس نے فاؤسٹ کو اپنے زمانے کے یورپی انسان کی "رومانی" روح قرار دیا ہے اور ہیلن کو قدیم یونانی انسان کی "کلاسکی روح"۔ رومانی روح میں جوش اور قوت اور وسعت ہے اور کلاسکی روح میں نظم اور ہم آہنگی۔ ان دونوں روحوں کے ملنے سے مکمل انسان بن سکتا ہے۔ فاؤسٹ کے شہنشاہ کے دربار میں جانے، وہاں ہیلن کی روح کو بلانے، اس کے عشق میں مبتلا ہونے اور ہم آغوشی کی آرزو میں ناکام رہنے سے یہ مراد ہے کہ جب جدید یورپی انسان مدنی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے تو وہ اپنے تمدن اور خود اپنے نفس کے اندر انتشار سا پاتا ہے اور اسے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قدیم یونانی تمدن کا مطالعہ کر کے صحیح اور ستھرا ذوقِ جمال حاصل کرے جس کے بغیر ترتیب اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسے محض تخیل کی مدد سے کلاسکی تہذیب کا جو نقش نظر آتا ہے وہ خیالی اور بے بنیاد ہے۔ اس کا گہرا مشاہدہ بغیر "تاریخی نظر" کے ناممکن ہے۔ اسی تاریخی نظر کو گوئٹے نے استعارے میں انسانی پتلا کہا ہے، جسے فاؤسٹ کا تخیل اور تفکر پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے واگنر کے صبر و استقلال اور محققانہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ البتہ اس سے کام وہی لے سکتا ہے جو تخیل کے پروں پر اڑے۔ بے چارہ محقق اس سے محروم رہتا ہے۔

غرض "انسانی پتلا" فاؤسٹ اور شیطان کو لے کر یونان پہنچتا ہے اور یہ سب کلاسیکی والپرگس کے جلسے میں شریک ہوتے ہیں جہاں تمام قدمائے یونان کی روحیں جمع ہیں۔ یہاں "انسانی پتلے" کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے اور اسے موت آ جاتی ہے جو اصل میں اس کی ولادت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخی نظر تخیل کے ساتھ مل کر علمی تحقیق کے تنگ دائرے میں محدود نہیں رہ سکتی بلکہ شاعرانہ مشاہدے کی وسیع فضا میں گم ہو جاتی ہے۔

فاؤسٹ، یونان میں ایک جرمن طرز کا قلعہ بناتا ہے اور جرمن سرداروں کے جھرمٹ میں وہاں رہتا ہے۔ شیطان ہیلن کو بہکا کر اس قلعے میں لاتا ہے۔ فاؤسٹ اور ہیلن کی شادی ہوتی ہے جس سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ لڑکا پل کر بڑا ہوتا ہے تو ایک دن جوانی کے جوش میں دوشِ ہوا پر اڑتا ہوا محدود فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ ہیلن بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے مگر دونوں کے لبادے فاؤسٹ کے پاس رہ جاتے ہیں جنہیں لے کر وہ شیطان کے ساتھ جرمنی کو لوٹتا ہے۔

یہاں گوئٹے نے رومانی اور کلاسکی روح کے امتزاج کی حدود دکھائی ہیں۔ عہدِ جدید کا انسان عہدِ قدیم کے تمدن کے مطالعے سے اتنا ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے کہ اس کا ظاہری رنگ اختیار کر لے۔

اس کا پیکر اصل رومانی ہی رہے گا۔ البتہ اس نے اوپر سے کلاسیکی روح کا لباس پہن لیا ہے۔

مگر یہ فائدہ بھی کم نہیں۔ فاؤسٹ جب ہیلن اور اس کے بیٹے کے لبادے لیے ہوئے لوٹتا ہے تو اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تمدنی زندگی کو ہم آہنگی کے ساتھ ترتیب دے سکے۔ شیطان اسے عیش و عشرت اور عزت و شہرت کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے دل میں محض قوت عمل اور انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے۔ وہ راہ میں سمندر کے کنارے ایک زمین کا خطہ دیکھتا ہے جسے پرشور سیلابوں نے کاٹ کر ناہموار کر دیا ہے۔ اسے عناصر کی اس تاخت و تاراج پر غصہ آتا ہے اور اس کے دل میں ولولہ اٹھتا ہے کہ یہاں پشتے بندھوا کر پانی کے زور کو توڑے اور اس زمین کو سمندر کے نیچے سے نکال کر اس پر ایک بستی بسائے۔ شیطان کے مشورے سے وہ بادشاہ کی ایک لڑائی میں مدد کرتا ہے اور اس سے یہ زمین جاگیر میں لے لیتا ہے۔

فاؤسٹ کی تجویز کامیاب ہوئی ہے۔ شیطان کی مدد سے سمندر کے کنارے پشتے باندھے جاتے ہیں، نہریں بنائی جاتی ہیں، گودیاں تعمیر ہوتی ہیں، جہازوں کی آمد و رفت ہونے لگتی ہے۔ تھوڑے ہی دن میں ایک بڑی بستی آباد ہو جاتی ہے جو فاؤسٹ کی حکومت میں مکمل تہذیب کا نمونہ بن جاتی ہے۔

مگر گوئٹے کی نظر سے جدید تمدن کا تاریک پہلو بھی مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یورپی انسان کے عمل کی محرک ایک حد تک انسانی ہمدردی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قوت و سطوت کا جذبہ۔ وہ نوع انسانی کی خدمت نہیں بلکہ اس پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور ترقی کے نشے میں کمزوروں کے جذبات کو پامال کرتا ہے بلکہ ان کے سروں کو پیر سے ٹھکراتا ہے۔

فاؤسٹ کی بستی میں پرانے زمانے کی یادگار ایک جھونپڑی رہ گئی ہے جو ایک بوڑھے مرد اور اس کی بڑھیا بیوی کا مسکن ہے۔ یہ دونوں اپنی جھونپڑی فاؤسٹ کے موعودہ محل کے بدلے بھی دینے کو تیار نہیں۔ فاؤسٹ کی نظر میں یہ چیز کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ وہ شیطان کو بھیجتا ہے کہ ان لوگوں کو زبردستی یہاں سے ہٹا دے۔ وہ جا کر جھونپڑی میں آگ لگا دیتا ہے جس میں بوڑھا اور بڑھیا بھی جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ فاؤسٹ جب یہ خبر سنتا ہے تو اسے بہت افسوس ہوتا ہے لیکن وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا ہے کہ تمدن کی ترقی کے لیے یہ ظلم ناگزیر ہے۔

وہ اپنے محل میں کھڑا آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں چار روحیں داخل ہوتی ہیں۔

ان میں سے ایک یعنی تشویش کی روح اس کے چہرے پر دم کرتی ہے اور وہ اندھا ہو جاتا ہے۔

اب وہ پھاوڑا چلنے کی آواز سنتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پشتے باندھنے کے لیے زمین کھودی جارہی ہے لیکن اصل میں شیطان اس کی قبر کھدوا رہا ہے۔ فاؤسٹ اس وقت اپنی بستی کی ترقی کی نئی تجویز سوچ رہا ہے۔ بستی پہاڑ کے دامن میں ہے اور اس کے قریب دلدل اور نم زمین ہے۔ فاؤسٹ اپنے خیال میں محو اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے اگر یہ زمین خشک کر لی جائے تو یہاں ایک اور بستی بسائی جاسکتی ہے۔ یہاں رہنا خطرناک ہوگا کیونکہ ہر وقت یہ اندیشہ رہے گا کہ کہیں سمندر کا سیلاب پشتوں کو توڑ کر ساری آبادی کو غرق نہ کردے مگر اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اگر لوگ ہمیشہ خطرے میں رہیں تو ہر وقت ہوشیار اور مستعد بھی رہیں گے۔ فاؤسٹ جب چشم تصور سے ان آزاد لوگوں کو اس آزاد کی ہوئی زمین پر دیکھتا ہے تو اس کا دل جوش مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار گزرنے والے لمحے سے کہتا ہے "ذرا ٹھہر جا' تو کتنا حسین ہے!"

اب فاؤسٹ معاہدے کی رو سے شیطان سے مغلوب ہو گیا ہے۔ ارضی زندگی نے اس کے دل کو لبھالیا ہے۔ اس کا طائر روح جو فضائے حقیقت میں پرواز کرنے کی آرزو میں ہر وقت تڑپا کرتا تھا تھوڑی دیر کے لیے قفس مجاز سے مانوس ہو گیا ہے لیکن شکست محض ظاہری ہے۔ واقعی شکست تو جب ہوتی کہ وہ مادی لذتوں پر پھسل پڑتا یا اپنی قوت پر مغرور ہو کر قدرت کاملہ سے سرکشی اختیار کرتا۔ بہ خلاف اس کے وہ "ابدی جوہر انوثیت" کے عشق کی بدولت شہوانی خواہشوں کی قید سے آزاد ہو چکا ہے' انسانی ہمدردی کے جذبے میں سرشار ہے اور اپنی قوت کو اپنی بصیرت کے مطابق تہذیب وتمدن کی ترقی میں صرف کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی اس کی ارتقا میں بہت سے مراحل باقی ہیں۔ ابھی وہ اس بیخودی کی لذت سے واقف نہیں جس سے خودی کی تکمیل ہوتی ہے ابھی اس میں اتنی پختگی نہیں پیدا ہوئی کہ نوع انسانی کی خدمت میں اپنی انفرادیت کو کھو کر اپنی شخصیت کو پالے اور تسلیم وعقیدت کے بحر ذخار میں ڈوب کر قطرے سے گہر بن جائے جس میں بقول غالب کے دریا کا اضطراب محو ہو جاتا ہے۔ لیکن رحمت ایزدی انسانی کوششوں کی محدودیت سے واقف ہے' وہ نیت کی پاکی اور سعی کی استواری کو دیکھتی ہے اور نتائج کی ناتمامی سے چشم پوشی کرتی ہے۔ وہ فرشتوں کی زبان سے کہتی ہے "جو روح سرگرم سعی ہے اسے ہم نجات دے سکتے ہیں۔"

عالم ارضی میں فاؤسٹ کی سعی اپنی حد کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا وقت پورا ہو گیا ہے اور معاہدے کے الفاظ کے مطابق "گھڑی بند ہو جاتی ہے، سوئی گر جاتی ہے" یعنی اس کی روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے۔ شیطان سمجھتا ہے کہ یہ روح اس کی ہو گئی لیکن فرشتوں کا گروہ آتا ہے اسے اپنے حسن سے مسحور کر دیتا ہے اور فاؤسٹ کی روح کو لے کر طبقات سماوی سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ راہ میں گریٹشن کا پیکر مثالی اپنی ماں کے گلے سے لپٹا نظر آتا ہے۔ یہ ابدی جوہر انوثیت کا ایک جلوہ ہے جو فاؤسٹ کی روح کے لیے شمع راہ کا کام دیتا ہے۔ اب یہ روح اس سرحد میں داخل ہو گئی ہے جہاں فروغ تجلی سے مرغ خیال کے پر جلتے ہیں۔ فقط قدسیوں کی سنگت کی آواز آ رہی ہے:

سب فانی چیزیں
محض مجازی نقوش ہیں!
عالم حقیقت میں سعی ناتمام
واقعہ بن جاتی ہے،
یہاں ارادہ ناگفتہ
پورا ہو جاتا ہے،
ابدی جوہرِ انوثیت
ہمیں آگے کھینچے لیے جاتا ہے"

باب ششم

تنقید اور خاتمہ

کسی نازک خیال معنی آفریں شاعر کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا ایسا ہے جیسے کسی گھنے تاریک جنگل میں راستہ ڈھونڈنا۔ ایسے موقع پر بہترین تدبیر یہی ہے کہ انسان بے دیکھے بھالے دلیری سے آگے بڑھا چلا جائے' تھوڑی دیر میں اس کی نظر تاریکی کی عادی ہو جاتی ہے' اسے اپنے گرد و پیش کے درخت صاف نظر آنے لگتے ہیں اور وہ حس مکانی سے کام لے کر جسے ہم "انکل" کہتے ہیں' سب سے سیدھا اور آسان راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ اگر تاریکی بہت زیادہ ہو تو اسے روشنی لے کر چلنا پڑتا ہے لیکن اس پر بھی صحیح سمت معلوم کرنے میں انکل ہی سے کام چلتا ہے۔ اسی طرح دقیق اور پیچیدہ نظموں کو سمجھنے کا بھی سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ پڑھنے والا ہمت کر کے پڑھنا شروع کر دے۔ کچھ دن کے بعد وہ شاعر کے طرز ادا سے اس کی مخصوص ترکیبوں سے' اس کی محبوب تشبیہوں اور استعاروں سے مانوس ہو جائے گا اور اپنے وجدان صحیح کی بدولت اس کا مدعا سمجھنے لگے گا لیکن اگر وہ نظم جو زیر مطالعہ ہے' بہت ہی پیچیدہ ہو تو ضرورت پڑتی ہے کہ شاعر کی زندگی' اس کے دوسرے کلام' اس کے عہد کی ادبی تحریکوں کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی جائے' یعنی خارجی شہادت کی بنا پر اس کی تفسیر کی جائے پھر بھی تفسیر کرنے والا شاعرانہ وجدان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

تفسیر یا تنقید کرنے والوں کو عموماً یہ دقت پیش آیا کرتی ہے کہ انہیں خارجی شہادت کا کافی مواد نہیں ملتا اور انہیں خود مفسر یا نقاد کے علاوہ محقق کا کام بھی انجام دینا پڑتا ہے لیکن گوئٹے کی شاعری خصوصاً فاؤسٹ کی تنقید میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں خارجہ مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ اس کو صحیح طریقے سے ترتیب دینا اور اس سے صحیح نتائج نکالنا دشوار ہے۔ اس گھنے جنگل کے رہرو کے لیے روشنی کی کمی نہیں بلکہ ہر طرف سے رنگ برنگ کی

شعرأ کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ گوئٹے کی سوانح عمری پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کی زندگی کے ہر دور کا کلام نظم اور نثر شائع ہو چکا ہے۔ اس کے خطوط، اس کے مکالمات کے متعلق اس کے ہم عصروں کی رائیں ہمارے سامنے موجود ہیں، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے شاہکار فاؤسٹ کی تفسیر ان سب چیزوں کی مدد سے ایسی کی جاتی جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی لیکن اس مقدمے کے دوسرے اور چوتھے باب کے مطالعے کے بعد ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اس کا کلام مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ ہے جن سے فاؤسٹ کی تفسیر کے متعلق قطعی نتائج نہیں نکل سکتے۔ اس لیے اس کے شارحوں اور نقادوں میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ گوئٹے کی روح فارسی شاعر کی زبان سے فریاد کرتی ہے "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔"

بظاہر ہمیں چاہیے تھا کہ ہم اس مقدمے کو پانچویں باب پر ختم کر دیتے اور فاؤسٹ کا ترجمہ بغیر کسی تنقید کے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے کہ وہ خود شاعرانہ وجدان اور ذوق سلیم کی رہنمائی سے اس کے مطالب کو سمجھیں اور اسے اعلیٰ شاعری کی کسوٹی پر کسیں لیکن دو وجوہ سے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اول تو ہم صرف پہلے حصے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس میں قصہ مکمل نہیں، اس لیے پڑھنے والوں کو شاعر کا منشا سمجھنے میں اور نظم کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں دشواری ہے۔ دوسرے ہمارے ملک کے لوگ ابھی تک عموماً مغربی شاعری اور خصوصاً جرمن شاعری کی روح کے محرم نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے پیش نظر وہ معیار ہی نہیں ہے جس پر اس نظم کو پرکھنا چاہیے جس طرح قصے کا خلاصہ بیان کرنے میں ہمیں جا بجا تنقیدی تشریح سے کام لینا پڑا۔ اسی طرح اب اس کی ضرورت ہے کہ باوجود ان مشکلات کے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں پورے ناٹک پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اس اہم فرض سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے لیکن کم سے کم ہمارے ناظرین کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ گوئٹے کی اس معرکتہ الآرا تصنیف پر کن کن پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہیے اور اس کی قدر و قیمت کن اصولوں کے ماتحت متعین کرنا چاہیے۔

شاعری کے ہر شاہکار کے تنقید میں دو اہم پہلو ہوتے ہیں:

(1) یہ معلوم کرنا کہ شاعر محض انسانی زندگی یا عالم فطرت کی ایک تصویر پیش کرنا چاہتا ہے یا اس کی تفسیر بھی۔ اس کا مقصد محض یہ ہے کہ آب و رنگ، لحن و صورت، الفاظ و معنی کے تناسب اور ہم آہنگی سے حسن ازل کا ایک جلوہ دکھا کر حسن پرستوں کو وجد میں لے آئے یا اسے اس پردے میں

حیات وکائنات کے کسی اہم مسئلے کو اپنے فطری مشاہدے اور شاعرانہ وجدان کی مدد سے حل کرنا مقصود ہے۔

(2) یہ فیصلہ کرنا کہ شاعر اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے اور اس کی نظم کی جمالی اور فلسفیانہ اہمیت کیا ہے۔

پہلے مسئلے میں فاؤسٹ کے نقادوں میں سخت اختلاف ہے۔ کسی کے نزدیک گوئٹے کا مقصد محض حیات انسانی کی نقاشی ہے۔ کسی کے نزدیک اس کی ترجمانی اور رہنمائی بھی۔ کسی کے خیال میں یہ محض چند متفرق تصویروں کا مجموعہ ہے کسی کے خیال میں ایک مکمل مرقع، یعنی مسلسل ڈرامہ۔ کوئی اسے ٹریجڈی سمجھتا ہے کوئی کامیڈی کوئی آپ بیتی جانتا ہے کوئی جگ بیتی۔ کوئی کہتا ہے یہ عہد جدید کے انسان کی رومانی روح کا عکس ہے کوئی کہتا ہے نہیں اس کی روحانی ارتقا یعنی رومانی اور کلاسکی عناصر کے امتزاج کا چربہ ہے۔

اس اختلاف کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ فاؤسٹ ساٹھ برس کے طویل عرصے میں لکھا گیا اور اس دوران میں اس کا مقصد کچھ سے کچھ ہوگیا۔ یہ زمانہ یورپ خصوصاً جرمنی کی تمدنی زندگی میں انقلاب کا زمانہ تھا۔ فاؤسٹ عہد انقلاب کا آئینہ ہے اس لیے اس میں متضاد عناصر کا پایا جانا حیرت انگیز نہیں۔ اس حقیقت کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں لیکن یہاں ہم اس پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے۔ متمدن قوموں کی زندگی ارتقا کے تین مدارج سے گزرتی ہیں۔ اس کے ادب کو بھی اگر وہ حقیقی معنی میں ادب یعنی زندگی کا آئینہ ہے یہی مدارج طے کرنا پڑتے ہیں۔

جب کوئی قوم بدویت سے تمدن کی سرحد میں داخل ہوتی ہے تو اس کی معاشرت اور اس کے خیالات میں یک رنگی خشونت اور مردانگی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی ایک مکمل اور سادہ نظام کے ماتحت ہوتی ہے اس کے پیش نظر ایک نصب العین ہوتا ہے۔ یہی حالت اس کے ادب کی بھی ہوتی ہے وہ اپنے جذبات کا اظہار عموماً شاعری کے ذریعے سے کرتی ہے اور شاعری میں بھی رزمیہ شاعری کو اختیار کرتی ہے۔ اس میں کسی ایسے ہیرو کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے جو ایک جانی بوجھی راہ پر چل کر رکاوٹوں کو آسانی سے دور کرتا ہوا کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا دور وہ ہوتا ہے جب فطری قوت ارتقا کی بدولت انسان اپنے تنگ دائرہ حیات کو توڑ کر

اس میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی ابتدا جذبات کے ہیجان سے ہوتی ہے جو ساری زندگی پر چھا جاتا ہے۔ انسان کے دل میں نئی آرزوئیں' نئے مقاصد پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں پورا کرنے کے لیے تڑپتا ہے۔ زندگی کا بندھا بندھایا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ہر فرد جماعت سے الگ ہو کر ادھر ادھر بھٹکتا ہے۔ یہ دور رومانی دور کہلاتا ہے۔ اس زمانے کے ادب میں جذبات پرستی' بے چینی' کشمکش آرزو غالب ہوتی ہے جس کے اظہار کا ذریعہ غنائی شاعری اور ڈرامہ میں المیہ ہے۔

تیسرا دور وہ ہے جب یہ پھیلی ہوئی زندگی سمیٹی جاتی ہے۔ اس تمدن کی جو بہت وسیع ہو گیا ہے حد بندی ہوتی ہے۔ اس میں ہم آہنگی اور ترتیب پیدا کی جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کا نصب العین نئے سرے سے معین ہوتا ہے اور معاشرت کا نظام دوبارہ قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے پیچیدہ مسائل ایک معینہ نصب العین کے ماتحت حل کیے جاتے ہیں۔ یہ دور کلاسکی دور کہلاتا ہے اور اپنے اظہار کے لیے ناول اور کامیڈی کا ذریعہ ڈھونڈتا ہے۔

یورپ کی تمدنی زندگی کا پہلا دور قرون وسطیٰ کا زمانہ تھا۔ حیات اجتماعی پر مذہب عیسوی اور کلیسائی نظام حاوی تھا۔ زندگی بہت تنگ تھی مگر مرتب و مکمل۔ اس عہد کا مصور اطالوی شاعر ڈانٹے ہے اور اس کی مشہور ایپک Divine Comedy اس کی بے مثل تصویر ہے۔

اس دور کا خاتمہ نشاۃ ثانیہ کے آغاز سے ہوا۔ پندرہویں صدی میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو یونانی تمدن کے حامل بھاگ کر اطالیہ آئے اور ان کے آنے سے یورپ کی زندگی میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ یورپی انسان کی نظر کیتھولک عیسائیت کے تنگ دائرے سے نکل کر وسیع میدان حیات تلاش کرنے لگی۔ اس کی توجہ کا مرکز عالم آخرت نہیں رہا بلکہ یہ دنیا اور یہ زندگی اس کی کشمکش اس کا نشیب و فراز اس کا راحت و الم' اس انقلابی عہد کا مکمل نقشہ شیکسپیئر کی شاعری میں موجود ہے۔ شیکسپیئر ڈرامہ نگار ہے اور اسے اس فن کی تمام اصناف ٹریجڈی' کامیڈی اور تاریخی ڈرامہ پر قدرت ہے۔ لیکن اس کا اصل آرٹ ٹریجڈی میں نظر آتا ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ اس نے انسانی جذبات کی رنگارنگی ان کے مد و جزر' ان کی باہمی کشمکش اور ان کے عبرت انگیز نتائج کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی ہیں۔

یہ رومانیت کا سیلاب ابھی اچھی طرح امنڈ نہ پایا تھا کہ عقلیت کے پشتوں سے اس کی روک تھام کر دی گئی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کا عقلیت کا فلسفہ فرانس میں پیدا ہوا اور پھر

انگلستان اور جرمنی وغیرہ میں پھیلا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ذہن انسانی کا عقلی عنصر جذبات و احساسات پر غالب آ گیا ہے، روایات و رسوم کی قید سے آزاد ہو گیا ہے اور اب انسانی زندگی پر محض عقل کی حکومت ہو گئی۔ ادب پر بھی آزاد خیالی کا رنگ چھا گیا تھا۔ ڈرامہ کا زور تھا اور اس میں مخصوص مذہبی عقائد اور اعمال کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ بے تعصبی اور روشن خیالی کی تلقین اور عقلی مذہب کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اصول میں سختی کے ساتھ یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی اور قدیم یونان اور روما کے قصے ناٹکوں اور غنائی نظموں کے موضوع قرار دیئے جاتے تھے۔ ادبی تاریخ میں یہ دور کلاسکی کے نام سے موسوم ہے۔

لیکن اس اصل میں اٹھارہویں صدی کی یہ فلسفیانہ اور ادبی تحریک یورپی ذہن کی فطری ارتقا کا نتیجہ نہ تھی بلکہ محض یونانیوں اور رومیوں کی تقلید سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے واقعی مناسبت جو کچھ تھی صرف فرانسیسیوں کو تھی اور وہی اس کو فروغ دینے میں کامیاب ہوئے۔ فرانس اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھا اور اس کا ذہنی اقتدار سارے یورپ پر مسلم تھا۔ اس لیے دوسرے ملکوں کو چار و ناچار اس کی پیروی کرنا پڑی۔ ان کے باشندوں کے ذہن میں ابھی اتنی پختگی نہ تھی کہ کلاسکی طرز خیال کو اپنا سکتے۔ یورپ کی عام تمدنی تاریخ میں اس تحریک کی اہمیت زیادہ تر منفی ہے۔ یہ ایک دفاعی جنگ تھی۔ قرون وسطیٰ کے ذہنی اثرات کے خلاف جواب تک عوام کے دلوں میں راسخ تھے ثبوتی حیثیت سے اس تحریک میں تخلیقی قوت بہت کم تھی۔ سچ پوچھیئے تو اس عہد کو کلاسکی کہنا محض زبردستی ہے۔ اس یکطرفہ عقلیت میں وہ توازن اور ہم آہنگی ہرگز نہ تھی جو یونانیوں کے دور آخر کے فلسفے اور ادب میں پائی جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں عقلیت کے خلاف ردعمل شروع ہوا۔ ایک طرف کانٹ کی دقیقہ سنجی نے اور دوسری طرف روسو کی آشفتہ نوائی نے اس کی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیا اور لوگوں کے دلوں سے اس کی حکومت اٹھ گئی۔

رومانیت کی دبی ہوئی تحریک پھر ابھری اور ساری تمدنی زندگی پر چھا گئی۔ ادب اور شاعری میں ہرڈر[1] نے مسلمہ قواعد اور مسلمہ عقائد کے پشتوں کو توڑ کر طوفان و ہیجان کی راہ کھول دی۔

رومانیت کی اس دوسری لہر میں پہلی لہر سے کہیں زیادہ زور تھا۔ شیکسپیئر کے عہد کے رومانی

---

1 ملاحظہ ہو باب اول کا آخری حصہ

جذبات پرستی قرون وسطیٰ کے بھولے پن کے ساتھ ملی جلی تھی۔ شیکسپیئر نے اصول فن کی قیود کو توڑ دیا لیکن رسم و رواج مذہب و اخلاق سے بغاوت نہیں کی۔ وہ دنیا اور زندگی کی نیرنگیاں دکھاتا ہے اور ان سے لطف اور عبرت حاصل کرتا ہے لیکن حیات و کائنات کے نظام پر اعتراض نہیں کرتا۔ وہ رند ہے مگر متشکک یا منکر نہیں۔ اس کی ٹریجڈی جذبات اور کیرکٹر کی ٹریجیڈی ہے، خیالات اور عقائد کی نہیں۔ جذبات و احساسات کے طوفان کے ساتھ خیالات اور عقائد کا ہیجان سب سے پہلے جرمنی میں ہرڈر سے شروع ہوا اور نوجوان شلر اور جوان گوئٹے کے یہاں اوج کمال کو پہنچا[1]۔

گوئٹے رومانیت کا مریض بھی تھا اور چارہ گر[2] بھی۔ اسے خدا نے یہ کمال دیا تھا کہ ہر درد کا درماں اسی درد سے اور ہر زہر کا تریاق اسی زہر سے نکال لیا کرتا تھا۔ طوفان و ہیجان کے عہد میں اس نے شورش اور اضطراب کی خلش کو اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ سکون و اطمینان کی آرزو میں تبدیل ہوگئی۔ اس کا فاؤسٹ اسی تغیر کی یادگار ہے۔ اسی لیے فاؤسٹ کا سمجھنا اس تغیر کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

سچا شاعر سچے مجدد کی طرح اپنے زمانے سے بنتا ہے اور پھر اسے بناتا ہے۔ ابتدا میں وہ زمانے کے دھارے کے ساتھ بہتا ہے یہاں تک کہ اس کی قوت کے راز کو سمجھ لے اور پھر اس قوت سے کام لے کر دریا کے رخ کو پلٹ دیتا ہے۔ گوئٹے نوجوانی میں بالکل اپنے زمانے کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "ویرتھر" اور "گوتس" وغیرہ سے قطع نظر کر کے اگر ہم صرف فاؤسٹ کے پہلے مسودے پر نظر ڈالیں جو Urfaust کے نام سے موسوم ہے تو خالص رومانیت کا مرقع نظر آتا ہے۔ یہ قصہ سراسر المیہ ہے: شک، اضطراب، مایوسی، ناکامی کی دل گداز داستان ہے۔۔ آگے چل کر شاعر کا تصور حیات بدلتا ہے، اب وہ ہنگامہ ہستی کو محض اپنے جذبات کا طلسم نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کا نظام سمجھتا ہے۔ اب وہ قیدِ حیات کو بندِ غم جان کر توڑنا نہیں چاہتا بلکہ روحانی ترقی کی ایک منزل سمجھ کر اس سے مانوس ہونا چاہتا ہے۔ جو تغیر اس کی طبیعت میں ہوا ہے وہی یہ پیغمبر سخن اپنی کتاب فاؤسٹ میں اور فاؤسٹ کے ذریعے سے اپنے ملک کی زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ فاؤسٹ کا قصہ وہی رہتا ہے۔ اس کے اکثر سین وہی رہتے ہیں لیکن اس کی روح بدل جاتی ہے۔ اب اس کے شک میں یقین کی، اضطراب میں سکون کی، مایوسی میں امید کی اور ناکامی میں کامیابی کی جھلک نظر

2،1 ملاحظہ ہو باب اول کا آخری حصہ

آنے لگتی ہے۔ بظاہر وہ اب بھی ٹریجڈی رہتی ہے لیکن اس میں کچھ کامیڈی کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض فاؤسٹ مغربی تمدن کے ایک دور کے انجام اور دوسرے دور کے آغاز کی یادگار ہے یا یوں کہئے کہ رومانی ادب اور کلاسکی ادب کی درمیانی کڑی ہے۔ اس لیے اس میں دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ آرٹ کا نمونہ بھی ہے اور متفرق تصویروں کا مجموعہ بھی' ٹریجڈی بھی ہے اور کامیڈی بھی' زندگی کا عکس بھی ہے اور اس کی تفسیر بھی۔ ممکن ہے کہ ان مختلف عناصر کے امتزاج میں' گوئٹے پوری طرح کامیاب نہ ہوا ہو لیکن اس کا مقصد یہی ہے اور ہم جب تک اس مقصد کو پیش نظر نہ رکھیں فاؤسٹ کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس بحث کے چھیڑنے سے اور بعض گزری ہوئی باتوں کو دہرانے سے ہماری غرض ایک تو یہ تھی کہ ناظرین فاؤسٹ کی ظاہری بے شکلی اور بے ترتیبی سے نہ الجھیں اور اس رشتہ اتحاد کو نظر میں رکھیں جو ان متفرق اجزاء کو ملاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اس اہمیت کو محسوس کر لیں جو فاؤسٹ کو یورپ کی ادبی اور تمدنی تاریخ میں حاصل ہے ورنہ اصل میں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد سوا ان فضلیت نما نقادوں کے جو اصطلاحی اور فنی بحثوں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں' ہر شخص یہی سمجھے گا کہ یہ ڈرامہ ہے اور فلسفیانہ ڈرامہ' کیونکہ اس میں گوئٹے نے روح انسانی کی اندرونی کشمکش سے وہ اثر پیدا کیا ہے جو دوسرے ڈرامہ نگار مختلف کرداروں کے ٹکراؤ سے کرتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فاؤسٹ میں گوئٹے نے خود اپنے نفس کے مختلف عناصر کی کشمکش اور اپنی سیرت کی ارتقا دکھائی ہے یا اپنے زمانے کی عام زندگی کی تحلیل اور تفسیر کی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابتدائی مسودے میں گوئٹے نے پندرہویں صدی کے عالم اور ساحر جان فاؤسٹ کی کہانی کو اپنے درددل کی داستان کے ساتھ ملا جلا کر بیان کیا تھا۔ اس کے بعد پہلے حصے میں پرانا افسانہ تقریباً نظر انداز ہو گیا اور محض آپ بیتی رہ گئی اور دوسرے حصے میں یہ آپ بیتی زبردستی جگ بیتی بنا دی گئی۔ اطالوی فلسفی اور نقاد کروچے کی رائے ہے کہ دوسرے حصے میں کوئی مسلسل قصہ نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کی چند متفرق تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ گوئٹے نے ساٹھ برس کے عرصے میں فاؤسٹ کے خاکے کو کئی بار بدلا اور موجودہ صورت میں یہ نظم مختلف عناصر سے

مرکب ہے لیکن ہمارے خیال میں باوجود اس اختلاف کے بنیادی مقصد اول سے آخر تک ایک ہے۔ ابتدائی مسودہ Urfaust بیشک محض آپ بیتی ہے لیکن موجودہ ترمیم شدہ اور مکمل فاؤسٹ کے دونوں حصوں میں شاعر آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی سناتا ہے۔ یعنی اپنے عہد کے یورپی انسان کی روحانی مصیبتوں کی داستان۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے حصے میں آپ بیتی کا پردہ بہت گہرا ہے اور دوسرے حصے میں ہلکا۔ پہلے حصے میں قصے کا سلسلہ پوری طرح قائم ہے' دوسرے میں متفرق کڑیاں ملتے نہیں پائیں۔

غرض گوئٹے کا مقصد یہی ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی اس طرح کہے کہ وہ اس کے عہد کی عام زندگی کی کہانی بن جائے۔ وہ اپنی ذات کو جدید یورپی انسان کی روحانی روح کی مثال بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس روح میں دو متضاد قوتیں ہیں۔

ایک قوت کا رجحان یہ ہے کہ نظام ہستی کا منشا معلوم کرے' روح کائنات کی حقیقت کو سمجھے اور اس سے اتحاد پیدا کرے۔ دوسری قوت یہ چاہتی ہے کہ زندگی کے نشیب وفراز کا عملی تجربہ حاصل کرے اور مادی لذتوں کا لطف اٹھائے۔ پہلی قوت انسان کے دل میں بلند اور برتر آرزوئیں پیدا کرتی ہے مگر راہ عمل نہیں دکھاتی۔ دوسری اسے ذوق عمل سے آشنا کرتی ہے مگر اسی کے ساتھ خودی اور لذت پرستی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پہلی کا نمائندہ فاؤسٹ ہے دوسری کا شیطان۔ انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے ان دونوں کا ملنا ضروری ہے۔ مگر اس طرح کہ فاؤسٹ غالب رہے اور شیطان مغلوب۔ ان دونوں کی باہمی کشمکش میں ایک تیسری قوت مداخلت کرتی ہے یعنی جوہرانوثیت۔ یہ محبت اور عقیدت اور تسلیم و رضا کا ابدی جوہر ہے جو کل کائنات میں جاری وساری ہے لیکن اس کا اصلی مظہر عورت ہے۔ یہی جوہرانوثیت گوئٹے کے نزدیک وہ چیز ہے جس کی جھلک ہر عاشق کو اپنی معشوقہ کی صورت اور سیرت میں نظر آتی ہے۔ عشق کا راز یہ ہے کہ روح انسانی میں طلب حقیقت کی جو آگ بھڑکتی ہے وہ علم وعمل کی چھینٹوں سے نہیں بجھتی بلکہ اس التہاب کو تسکین دینے کے لیے کسی ایسی قوت کی ضرورت ہے جو خلیل اللہ کی طرح اس آگ کو گلزار بنا دے۔ یہ قوت ذوق بے خودی' لذت تسلیم' کیف محبت ہے، جو آسمان کے ستاروں میں، سمندر کی لہروں میں، پہاڑوں کی چوٹیوں میں' جنگل کے درختوں میں' غرض ساری فطرت خاموش میں پائی جاتی ہے۔ مگر اس کا زندہ مجسمہ عورت ہے جو روح کائنات سے اتحاد کامل رکھتی ہے۔ جوہرانوثیت

کا نمائندہ گوئٹے نے گریٹشن کو بنایا ہے۔ فاؤسٹ اگر شیطان پر غالب آسکتا ہے تو صرف گریٹشن کی مدد سے۔ ان تینوں کے باہمی تعلق کو دکھانا اصل میں عہد جدید کے یورپی انسان کی روحانی کشمکش کی تفسیر ہے۔

غالباً اب فاؤسٹ کی فلسفیانہ حیثیت ناظرین پر واضح ہوگئی ہوگی مگر جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اس کا مصنف کوئی خشک علمی مقالہ لکھنا نہیں چاہتا بلکہ فلسفہ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کرنا چاہتا ہے۔

آرٹ کی ہر صنف خصوصاً ڈرامہ کا بہترین نمونہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں عمومیت اور انفرادیت دونوں کی شان ہو۔ یعنی حیات انسانی کا جو مرقع پیش کیا جائے وہ ہو تو کسی خاص زمانے کے خاص شخص کی تصویر لیکن ایسی ہو کہ اس میں ہر عہد کے انسان کو اپنی زندگی کی جھلک نظر آئے۔ جن لوگوں کا قصہ بیان کیا جائے ان کی جداگانہ خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ جیتے جاگتے چلتے پھرتے انسان معلوم ہوں مگر اسی کے ساتھ ان کے کیرکٹر میں وہ عام صفات بھی نمایاں کی جائیں جو ساری نوع انسانی میں مشترک ہیں۔ فاؤسٹ کے پہلے حصے میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ البتہ دوسرے حصے میں استعاریت اتنی غالب آگئی ہے کہ واقعیت اور اس کے ساتھ انفرادی رنگ تقریباً معدوم ہوگیا ہے۔ ہمیں یہاں دوسرے حصے سے بحث نہیں لیکن پہلے حصے کے متعلق ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ آرٹ کا مکمل نمونہ ہے۔ قصے کا محل وقوع جرمنی اور زمانہ سولھویں صدی ہے۔ مقامات اور مناظر سب اصلی ہیں۔ اس عہد کے لوگوں کے طرز معاشرت' ان کے خیالات ان کے عقائد کے دکھانے میں تاریخی صحت کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں جیسے روحوں کے تھیٹر میں گوئٹے نے اپنے ہم عصر نقادوں اور ادیبوں پر چوٹ کرنے کی غرض سے ایسی چیزیں بھی داخل کر دی ہیں جو فنی اور تاریخی نقطہ نظر سے بالکل نامناسب اور بیجا ہیں مگر مجموعی حیثیت سے فاؤسٹ کا پس منظر (Background) اصلیت کے مطابق ہے جس سے اشخاص کی انفرادیت نمایاں کرنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے پھر سیرت نگاری میں شاعر کے قلم نے یہ کمال کیا ہے کہ مارتھے اور واگنر سے لے کر (جو محض افراد کی حیثیت رکھتے ہیں) گریٹشن' فاؤسٹ اور شیطان تک (جو روح انسانی کی مختلف قوتوں کے نمائندے ہیں) سب کیرکٹر ایسے سچے اور زندہ معلوم ہوتے ہیں گویا ہم نے انہیں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور ان سے باتیں کی ہیں۔ مارتھے' واگنر طالب علم اور

دوسرے ضمنی کیرکٹر تو خیر معمولی اور یک رنگ طبیعت رکھتے ہیں ان کی تصویر کامیابی سے کھینچنے میں گوئٹے کی محض اتنی تعریف ہے کہ وہ اپنے مرقع کی جزویات پر بھی پوری توجہ صرف کرتا ہے لیکن گریٹشن فاؤسٹ اور شیطان کی سیرت گوناگوں عناصر سے مرکب ہے۔ ان کی شبیہ میں مختلف رنگوں کو اس طرح ملانا کہ اس پر نقاش ازل کے بنائے ہوئے نقش کا دھوکہ ہو جائے حقیقت میں فطرت انسانی کے مصور کا اعجاز ہے۔

یہ تو انفرادیت ہوئی۔ اب عمومیت کے لحاظ سے دیکھیے تو فاؤسٹ وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا اصل مقصد عہد جدید کے یورپی انسان کی زندگی دکھانا ہے۔ اس کے قصے کا سارا ماحول یورپ کا ہے اور دوسرے حصے میں جن اقتصادی اور معاشرتی مسائل کا ذکر آیا ہے وہ بھی زیادہ تر یورپ سے متعلق ہیں، لیکن جس روحانی کشمکش کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے وہ ہر عہد اور ہر ملک کے انسانوں میں مشترک ہے۔ ہر متمدن انسان کے دل میں راز کائنات کو سمجھنے اور روح کائنات سے متحد ہونے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ ہر انسان اس مشکل کو علم کی مدد سے حل کرنا چاہتا ہے اور ناکام ہوتا ہے۔ ہر انسان ذوق عمل اور مادی لذت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتا ہے اور نہیں پاتا' ہر انسان کو روحانیت اور مادیت' اثبات ونفی' بے خودی اور خودی کی کشمکش میں محبت اور عقیدت سے تقویت پہنچتی ہے اور اسی کی بدولت نجات کی راہ نظر آتی ہے۔ اس لیے اگر فاؤسٹ شیطان اور گریٹشن کے قصے کو عام انسانی زندگی کا مرقع کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

ہم نے اس تنقید کی بنا دو سوالوں پر رکھی تھی پہلا سوال یہ تھا کہ فاؤسٹ کے لکھنے میں گوئٹے کا مقصد کیا تھا؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا؟ پچھلے صفحات میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی روحانی کشمکش کی اجمالی تفسیر اور فلسفیانہ تفسیر پیش کرنا چاہتا ہے اور ضمناً یہ بھی دکھا دیا ہے کہ اسے ان دونوں چیزوں میں پوری کامیابی ہوئی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گوئٹے کے فاؤسٹ نے روح انسانی کی جن مشکلات کا نقشہ کھینچا ہے' ان کا حل بھی بتایا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ہم پانچویں باب میں قصے کا خاصہ بیان کرنے کے سلسلے میں دے چکے ہیں۔ گوئٹے کے نزدیک اس کے زمانے کی رومانی روح جسے ایک طرف علم وعرفان کی آرزو کھینچ رہی ہے اور دوسری طرف عملی زندگی اور مادی لذات کا شوق' اگر اس

کشمکش سے نجات پاسکتی ہے تو محض محبت اور عقیدت کے ذریعے سے مگر اس دولت کو پانے کے لیے اسے بہت سی کٹھن منزلوں سے گزرنا ہے۔ پہلے اسے قدیم یونان کی کلاسکی روح سے متاثر ہو کر جمالی ترتیب اور ہم آہنگی حاصل کرنا ہے اس کے بعد مدنی زندگی کی تشکیل اس طرح کرنا ہے کہ قوت کے ولولے اور خدمت کے جذبے میں توازن پیدا ہو۔ گوئٹے جانتا ہے کہ پہلا کام دشوار ہے اور دوسرا دشوار تر لیکن اسے یقین ہے کہ اگر روح انسانی خلوص سے اپنے امکان بھر کوشش کرے گی تائیدالٰہی اسے محبت وعقیدت کا جلوہ دکھا کر عالم حقیقت میں پہنچا دے گی۔ جہاں اس کی ''سعی'' اتمام سے ہم آغوش ہوگی۔ اس نے اپنے رفیقوں کو اور اپنے بعد آنے والوں کو روحانی ترقی کا زینہ دکھا دیا ہے لیکن یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس کی آخری سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے ''کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے۔'' اس ''اشارے'' کی حقیقت کیا ہے اور یہ کیوں کر ظاہر ہوتا ہے' اس کا جواب گوئٹے کے پاس نہیں۔ وہ خود ایک گہرا مذہبی عقیدہ رکھتا ہے لیکن یہ عقیدہ محض باطنی وجدان کی حد تک ہے' جسے وہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس بارے میں وہ اوروں کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔

فلسفی شاعر کا جو فرض تھا وہ اس نے ادا کر دیا۔ فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی حد بس یہیں تک ہے۔

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

تہدیہ

کیوں اے سیماب روشن تصورات تم پھر میرے سامنے آ گئے؟ ایک دن تھا کہ میں تمہیں دھندلی نظروں سے دیکھتا تھا کیا اب میں تمہیں الفاظ کے رشتے میں پرونے کی کوشش کروں؟ کیا میرے سر میں اب تک تمہارا سودا باقی ہے؟ اللہ رے تمہارا ہجوم اور تمہاری ریل پیل! اچھا لو آؤ اور میرے دل میں راجا بن کر براجو اے دل فریب خیالو جو کہر اور دھند سے اُمڈے چلے آتے ہو میرے سینے میں جوانی کی آگ پھر بھڑک اٹھی ہے۔ اس جادو کی ہوا سے جو تمہارا طوفان ساتھ لایا ہے۔

تم مجھے میری عشرت فانی کے نقشے دکھا رہے ہو اور وہ صورتیں جو مجھے پیاری تھیں پھر نظر آ رہی ہیں' کسی پرانے گیت کی طرح جو بھولا ہوا سا' بے صدا سا ہو۔ مجھے ان پر پہلی محبتوں اور دوستیوں کی یاد پھر ستا رہی ہے۔ پرانی چوٹیں پھر ابھر آئی ہیں۔ نئے سرے سے زندگی کی بھول بھلیاں سے نوحہ غم کی آواز بلند ہے اور ان دوستوں کا ماتم کر رہی ہیں جو چین کی گھڑیوں کی آرزو کرتے کرتے تقدیر سے مایوس ہو کر مجھے جدائی کا داغ دے گئے۔

وہ روحیں جنہیں میں اپنے پہلے گیت سناتا تھا۔ میرے آخری نغموں کو نہیں سن سکتیں۔ وہ پیار اور اخلاص کی صحبتیں منتشر ہو گئیں: میرے راگ کی پہلی صدائے بازگشت نامحدود فضا میں گم ہو گئی۔ اب میری تلخ نوائی کی سننے والی ناآشنا صورتیں ہیں جن کی تعریف سے میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے پرانے قدردانوں میں سے دو چار جو بچ رہے ہیں خدا جانے کہاں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

میرے دل میں اس سنجیدہ اور پرسکون عالم ارواح کی آرزو جو مدتوں سے دب گئی تھی پھر ابھر آئی ہے۔ میرا شکستہ گیت ایولی[1] رباب کے راگ کی طرح بے ترتیب سروں میں بکھرا جاتا ہے' مجھ پر روحانی خوف طاری ہے' میری آنکھ سے آنسو جاری ہیں' میرا دل جو لوہے کی طرح مضبوط تھا اب نرم اور کمزور ہے' جو چیزیں میرے پاس ہیں وہ دور نظر آتی ہیں اور کھوئی ہوئی چیزیں حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔

1. Aeolian Harp ایک باجا جو ہوا چلنے سے خود بخود بجتا ہے۔
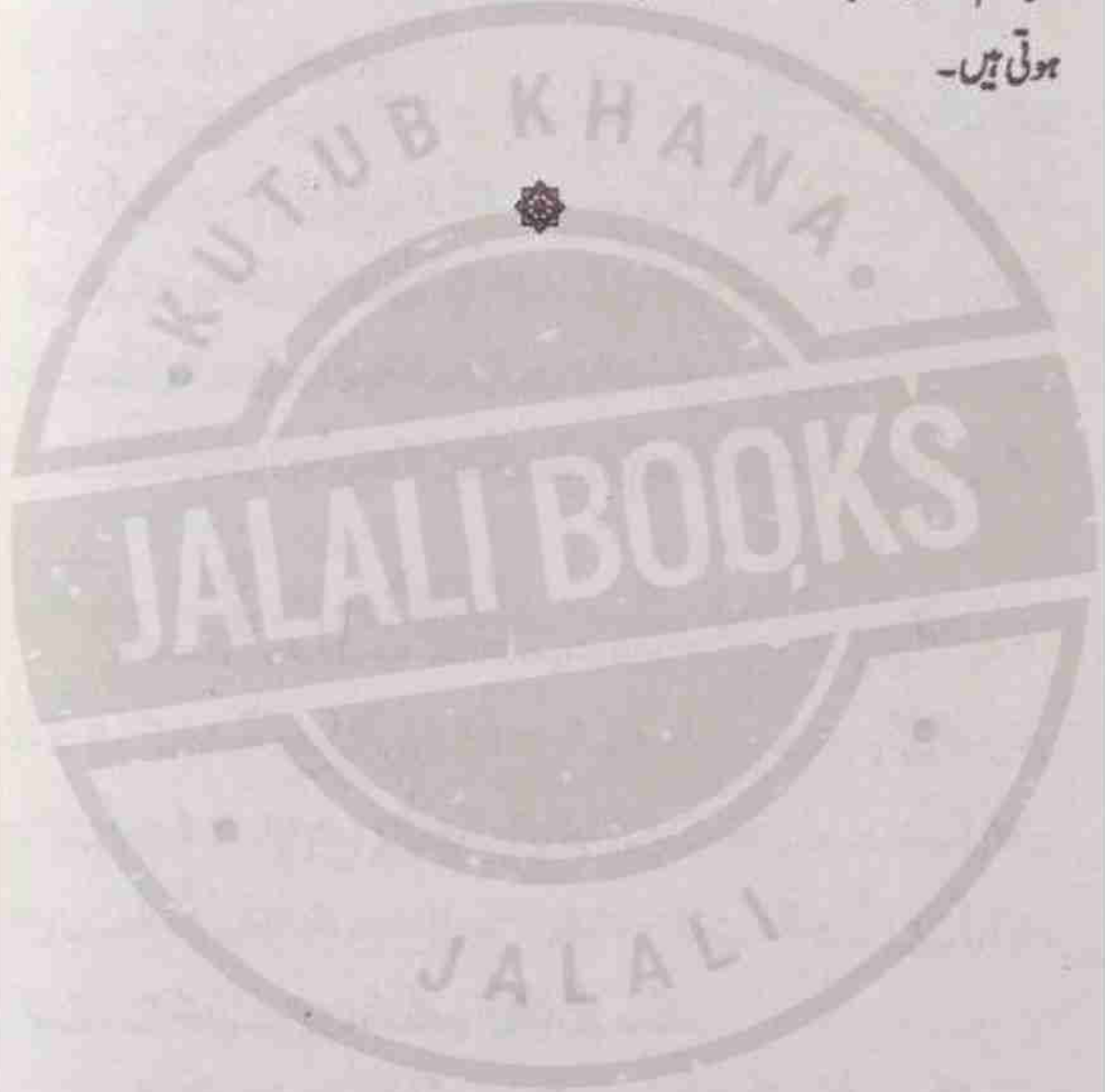
تماشا گاہ کا تمہیدی سین

منیجر، شاعر، مسخرا

منیجر: تم دونوں نے بارہا مصیبت اور پریشانی میں میری مدد کی ہے' اب یہ تو بتاؤ تمہارے خیال میں ہمارا کام جرمنی کی سرزمین میں چمکے گا یا نہیں؟ مجھے تو عوام کے خوش کرنے کی فکر ہے کیونکہ ان کا عمل اس پر ہے "جیو اور جینے دو۔" کھمبے کھڑے ہو چکے ہیں' تختے جڑے جا چکے ہیں' اب ہر شخص ہم سے روحانی ضیافت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ دیکھو تماشائی پالتھی مارے' بھویں چڑھائے بیٹھے ہیں اور ایسی چیز دیکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ حیران رہ جائیں۔ میں ان کے مذاق کو خوب سمجھتا ہوں لیکن اس بار میں ایسا پریشان ہوں کہ کبھی نہ تھا۔ یہ مانا کہ وہ اعلیٰ درجے کے تماشے دیکھنے کے عادی نہیں لیکن کمبخت ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آخر انہیں کیا چیز دکھائیں جو نئی اور انوکھی ہو۔ معنی خیز ہو مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہو کیونکہ سچ پوچھو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے سے تھیٹر میں تماشائیوں کا ہجوم ہے اور وہ چیختے چلاتے' داخلے کے تنگ دروازے پر یوں پلے پڑتے ہیں گویا وہ جنت کا دروازہ ہے۔ چار بجے دن ہی سے ٹکٹ گھر کے سامنے ان میں دھکم دھکا ہونے لگتی ہے اور ہر شخص ٹکٹ کے لیے جان لڑا دیتا ہے جیسے قحط کے زمانے میں نان بائی کی دکان پر۔ اتنے مختلف مذاق کے لوگوں پر ایسا جادو کرنا شاعر ہی کا کام ہے۔ تم بھی آج یہ کر دکھاؤ تو کیا بات ہے۔

شاعر: میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ لو جسے دیکھ کر رفعت خیال رخصت ہو جاتی ہے۔ مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ مجھے تو اس گوشہ تنہائی میں لے جاؤ جہاں بہشت کا سا سکون ہے جہاں اس خالص مسرت کے پھول کھلتے ہیں جس کا لطف بس شاعر ہی اٹھا سکتا ہے جہاں دل کو محبت اور دوستی کی سعادت نصیب ہوتی

ہے۔ وہ باغ جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا اور سنوارا ہے۔ ہائے کیا غضب ہے کہ وہ اچھوتے مضامین جو شاعر کے قلب کی گہرائی میں پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں ان کی زبان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں برے بھلے انداز سے بیان کرتی ہے' موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ (حالانکہ) اکثر شاعر کی افکار برسوں کے ریاض کے بعد مکمل صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ملمع کی چیزیں موجودہ لمحے کے لیے ہوتی ہیں اور کھرا سونا آئندہ نسلوں کے لیے امانت رہتا ہے۔

مسخرا: جی بس آئندہ نسلوں کا ذکر تو رہنے ہی دیجیے۔ اگر میں آئندہ نسلوں کی فکر میں رہوں تو موجودہ نسلوں کو کون ہنسائے؟ یہ بھی تو ہنسنا چاہتی ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ مانا کہ مستقبل کی بڑی اہمیت ہے مگر میرے جیسے یار شاطر کا حال بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟ جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں ادا کرنا آتا ہے۔ وہ عوام کے تلون کا رونا نہیں روتا؟ اس کے لیے تو جتنا بڑا حلقہ ہوا اتنا ہی اچھا۔ جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا تو سمجھے بھائی ذرا ہمت کرو اور ایک شاہکار لکھ ڈالو جس میں تخیل اپنے پورے طائفے کے ساتھ ہو اور حکمت بھی ہو عقل سلیم بھی ہو جذبات بھی ہوں جوش بھی ہو مگر ہاں یہ یاد رہے مسخرا پن بھی ضرور ہو۔

منیجر: خصوصاً واقعات بہت سے ہوں۔ لوگ اس لیے آتے ہیں کہ کچھ ہوتا ہوا دیکھیں۔ اگر قصے میں بہت سے دلچسپ سین ہوں، کہ لوگ حیرت سے منہ پھیلائے دیکھا کریں تو بس سمجھ لو کہ تمہاری شہرت پھیل گئی اور تم ہر دل عزیز ہو گئے۔ بہت لوگوں کو رجھانے کے لیے بہت سی چیزیں چاہیں تا کہ ہر شخص کو کوئی چیز اپنے ڈھب کی مل جائے۔ جو بہت کچھ دیتا ہے وہ بہتوں کو کچھ دیتا ہے اور ہر شخص خوش خوش گھر جاتا ہے۔ اگر تم قصہ دکھاتے ہو تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دکھاؤ۔ ایسے پسندے لوگوں کو پسند آئیں گے؟ ایسا قصہ لکھنا بھی آسان ہے اور دکھانا بھی آسان۔ اگر مسلسل تماشا دکھایا بھی تو کیا فائدہ؟ دیکھنے والے تو سلسلے کو توڑ ہی کے دیکھیں گے۔

شاعر: اور تماشا جو مٹی میں مل جائے! اگر تمہیں اس کا کیا احساس' تم کیا جانو اس میں شاعر کی کیسی ذلت ہے۔ تم تو بازی گر شاعروں کی تک بندی کا کلمہ پڑھتے ہو۔

منیجر: تم خوب اعتراض کرو میں برا نہیں مانتا۔ جو کوئی اپنے اپنے کام میں کامیابی چاہتا ہے وہ مناسب اوزار استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا تو سوچو کہ تمہیں کچی لکڑی چیرنا ہے، جن کے لیے تم لکھتے ہو ذرا ان کو بھی تو دیکھو۔ کوئی (تماشے میں) بے شغلی سے اکتا کر آیا ہے۔ کوئی الوان نعمت

سے سیر ہو کر اور قیامت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ اخبار چھوڑ کر آئے ہیں۔ ان کو سوانگ دیکھنے کی امید، شوق کے پروں پر اڑا کر لائی ہے۔ خواتین بناؤ سنگار کیے تماشائیوں کو مفت کا تماشا دکھاتی ہیں۔ تم اپنی شاعری کی چوٹی پر بیٹھے تخیل کے مزے لیتے ہو، تمہاری بلا سے تھیٹر بھرا ہو یا خالی ہو ذرا اپنے قدر دانوں کو قریب سے تو دیکھو، آدھے بے حس ہیں اور آدھے بے تمیز۔ ایک تو تماشے سے جا کر تاش کھیلے گا اور دوسرا کسی بیسوا کے آغوش میں رات گزارے گا۔ ان بے چارے سادہ لوحوں کو کیوں ستاتے ہو کہاں یہ اور کہاں آرٹ کی دیویاں! بس تم تو لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ اور لکھو اور لکھو پھر تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ ایسی ترکیب کرو کہ لوگ چکر میں آ جائیں۔ ان کو خوش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ ہائیں یہ تمہیں کیا ہوا! خوش ہو گئے یا خفا ہو گئے؟

شاعر: جا دور ہو یہاں سے، کسی اور غلام کو ڈھونڈ! کیا خوب! شاعر تیری خاطر اپنے عزیز ترین حق کو، فطرت کے عطا کیے ہوئے حق انسانیت کو مسخرے پن میں برباد کر دے! اس کے پاس کیا چیز ہے جس سے وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے اور سارے عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ بجز اس ہم آہنگی کے جو ساری کائنات کو اس کے دل سے متحد کر دیتی ہے۔ جب فطرت ابدی رشتہ تقدیر کو بے پروائی سے کاٹ کر بل پر بل دیئے جاتی ہے اور رباب زندگی کے الجھے ہوئے تاروں سے بے سری صدائیں نکل کر سامعہ خراشی کرتی ہیں تو کون دیدہ ریزی سے ان تاروں کو سلجھاتا ہے اور ان کو کس کر نغمہ حیات میں روانی پیدا کرتا ہے؟ کون انفرادی روح کا سُر کائنات کے مہاسُر سے ملا کر ہم آہنگ، دلکش راگ سناتا ہے؟ کون جذبات قلب کی شورشوں سے طوفان کا منظر دکھاتا ہے؟ کون سنجیدہ تفکر سے شفق شام کا سماں باندھتا ہے؟ کون بہادر کے سارے خوشرنگ پھولوں کو محبوب کی رہ گزر میں بچھا دیتا ہے؟ کون بے حقیقت سبز پتوں سے عزت کے ہار بنا کر ہر سورما کے گلے میں ڈالتا ہے؟ کون کوہ اولمپس[1] کی حفاظت کرتا ہے اور دیوتاؤں میں میل کراتا ہے؟ وہی قوت انسانی کا اعلیٰ مظہر جسے شاعر کہتے ہیں۔

مسخرا: اچھا اب مجھ سے سنیئے یہ قوت کیونکر ظاہر ہوتی ہے: شاعری کا دھندا اسی طرح چلتا ہے جیسے عاشقی کا سودا ہوا کرتا ہے۔ کوئی اچھی صورت نظر آئی دل پر چوٹ لگی، قدم رک گئے اور رفتہ رفتہ ہم دام الفت میں اسیر ہو گئے۔ پہلے تو قسمت یاوری کرتی ہے پھر اس سے لڑائی ٹھن جاتی ہے،

---

1 یونانی علم الاصنام میں اولمپس اس پہاڑ کا نام ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

پہلے زمانے نے مسرت کی ایک جھلک دکھائی پھر ستم ظریفی شروع کردی بس چشم زدن میں ایک رومان تیار ہوگئی۔ آؤ ہم بھی ایک ایسا تماشا دکھائیں۔ بس اپنا موضوع انسانی زندگی کو بنالو جسے بسر سب کرتے ہیں مگر سمجھتے کم ہیں۔ اس کا جو رخ لے لو وہی دلچسپ ہے گونا گوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم غلطیوں کا انبار اور حقیقت کی ایک ذرا سی چنگاری۔ اس نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے ساری دنیا کو سرور اور تقویت حاصل ہو۔ پھر دیکھنا کہ تمہارے تماشے میں کیسے کیسے حسین جوان آتے ہیں اور تمہاری لن ترانیوں کو کس شوق سے سنتے ہیں پھر ہر درد آشنا دل تمہارے کلام سے حسرت واندوہ کا لطف اٹھائے گا کوئی بات ایک کو تڑپائے گی۔ کوئی دوسرے کو اور ہر شخص کو وہ ہی چیز نظر آئے گی جو اس کے دل میں ہے۔ یہ نوجوان اب تک ذرا سی بات میں ہنسنے اور رونے لگتے ہیں اب تک زور کلام کی قدر کرتے ہیں اور ظاہری خوبیوں پر سر دھنتے ہیں۔ پختہ مغزوں سے بے شک کوئی امید نہیں لیکن خام کار نوجوان تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

شاعر: اچھا تو مجھے بھی وہ دن واپس لا دو جب میرا بادۂ زندگی ہنوز نارسا تھا' جب میرے سرچشمہ فکر سے لگاتار نئے نئے نغمے ابلتے تھے' دنیا میری نظروں میں ایک طلسم اسرار تھی اور ہر کلی ایک راز سربستہ۔ آہ! اس زمانے میں سب وادیاں پھولوں سے مالا مال تھیں اور یہ سب پھول میرے دامن میں تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اور سب کچھ تھا یعنی ایک دل جس میں حقیقت کی طلب تھی اور مجاز کا عشق لاؤ مجھے وہ من کی موجیں اسی اگلی سی وحشت کے ساتھ واپس دے دو وہ گہری پر درد لذتیں' وہ نفرت کی قوت اور محبت کی طاقت' لاؤ مجھے میری جوانی پھیر دو۔

مسخرا: میرے پیارے دوست تمہیں جوانی کی ضرورت تو جب ہوتی کہ تم میدان جنگ میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوتے یا کوئی خوبصورت نازنین تمہارے گلے میں بانہیں ڈال کر زور سے بھینچ لیتی یا تم دوڑ میں مقابلہ کرتے اور دھائی تک پہنچنے کی قوت نہ پا کر انعام ہار کر دور سے دیکھ کر للچائے یا دیوانہ وار رقص کرنے کے بعد رنگ رلیاں مناتے اور شراب و کباب میں رات بسر کرنے کے قصد سے بیٹھتے۔ مگر بڑے میاں تمہارا کام تو یہ ہے کہ ساز زندگی کے جانے بوجھے تاروں کو ہمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بجاؤ اور جو منزل تمہارے پیش نظر ہے وہاں تک بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جاؤ۔ یقین جانو کہ اس سے ہمارے دل میں تمہارا احترام کم نہیں ہوتا۔ وہ غلط ہے کہ بڑھاپے میں بچپن لوٹ آتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپن نہیں جاتا۔

منیجر: بس باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کی باری ہے۔ جتنا وقت اس چنیں چناں میں ضائع ہوا اس میں کوئی مفید کام ہو سکتا تھا۔ یہ بیکار عذر ہے کہ طبیعت موزوں نہیں۔ جو ہچکچاتا ہے اس کی طبیعت کبھی موزوں نہیں ہوتی۔ جب تم شاعر بنتے ہو تو شاعری کی باگیں سنبھالو۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے' ہمیں زوردار شراب معنوی چاہیے۔ بس دیر نہ کرو جھٹ پٹ تیار کردو۔ جو کام آج نہ ہوا وہ کل بھی نہ ہوگا۔ کوئی دن بیکار نہ کھونا چاہیے' ہمت مردانہ وقت کو ایسا مضبوط پکڑتی ہے کہ وہ نکل کر جا نہیں سکتا۔ جب یہ قابو میں آ گیا تو کام خود بخود ہوتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ ہماری جرمن اسٹیج پر جس کا جو جی چاہے دکھا سکتا ہے۔ اس لیے تم بھی پردوں اور مشینوں سے دل کھول کر کام لو ہلکی اور تیز روشنی دونوں کو استعمال کرو اور ستاروں کی بھرمار کردو۔ ہمارے یہاں پانی' آگ' پہاڑ' چرند پرند کی کمی نہیں۔ بس اسی لکڑی کے تنگ گھروندے کے اندر ساری کائنات کا نقشہ دکھا دو۔ آسمان سے زمین' زمین سے پاتال تک کی سیر کرو' تیزی سے مگر سنبھلے ہوئے۔

آسمان پر تمہیدی سین

اسرافیل: سورج کا نغمہ بدستور اپنے ہم چشم کرّوں کے راگ سے ہم آہنگ ہے اور اپنا مقدر دور رعد کی سی تیزی سے پورا کر رہا ہے۔ اسے دیکھ کر فرشتوں کا دل بڑھتا ہے۔ اگرچہ وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قدرت کی معجزنما مناعیاں ویسی ہی حسین ہیں جیسی صبح ازل کو تھیں۔

جبرائیل: عروس زمین بے انتہا تیزی سے رقص کر رہی ہے' باری باری سے روشن' خوش نما دن اور تاریک بھیانک رات کی جھلک نظر آتی ہے۔ سر بفلک پہاڑوں کے دامن میں وسیع سمندر لہریں لے رہا ہے اور پہاڑ اور سمندر دونوں کرہ ارض کے ساتھ ساتھ ابدی گردش میں مصروف ہیں۔

میکائیل: تند و تیز طوفان سمندر سے خشکی اور خشکی سے سمندر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور طلسمی زنجیروں کی طرح زمین کی کمر سے لپٹے ہوئے ہیں۔ بادل کی گرد کے ساتھ بجلی چمک کر ایک آگ سی لگا دیتی ہے لیکن اے رب جلیل تیرے چاؤش تیرے دن کے سبک رفتار جلوس کی خبر دے رہے ہیں۔

شیطان: یارب چونکہ تو نے پھر میری طرف توجہ کی اور میری خیریت پوچھی اور یوں بھی تو میرے آنے سے خوش ہوتا ہے' اس لیے میں بھی تیرے غلاموں کے زمرے میں حاضر ہوا ہوں۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ مجھے فصیح و بلیغ گفتگو نہیں آتی۔ تیرے مقربین مجھ پر خوب ہنسیں گے بلکہ تو بھی اگر ہنسنے کی عادت ترک نہ کر چکا ہوتا تو میری باتوں پر ضرور ہنستا۔ مجھے سورجوں اور کائناتوں کی خبر نہیں میں تو فقط انسانوں کی مصیبتوں کو دیکھا کرتا ہوں۔ اس زمین کے باشندے دیوتا کے اب تک وہی دم خم ہیں اور یہ آج بھی ویسا ہی چوں چوں کا مربا ہے جیسا ازل کے دن تھا۔ شاید اس کی حالت کچھ بہتر ہوتی اگر تو اسے یہ آسمانی نور کی پرچھائیں نہ بخشتا وہ اسے عقل کہتا ہے مگر اس سے وہ

کام لیتا ہے جو بہائم اپنی بہیمیت سے بھی نہیں لیتے۔ خطا معاف مجھے تو وہ لمبی ٹانگوں والے ٹڈے کی طرح معلوم ہوتا ہے جو ہمیشہ اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اڑتے اڑتے کود کر گھاس میں گرتا ہے اور اپنا گیت گانے لگتا ہے۔ کاش وہ گھاس ہی میں پڑا رہتا' مگر وہ تو ہر جگہ ٹانگ اڑانے کو موجود ہے۔

صدائے غیبی: بس تجھے اتنا ہی کہنا ہے؟ کیا تو ہمیشہ شکایت ہی کرنے آتا ہے؟ کیا تجھے زمین اب بھی پسند نہیں۔

شیطان: بیشک میرے مالک مجھے تو وہاں ویسی ہی ابتری نظر آتی ہے۔ انسان کے حال زار پر مجھے افسوس آتا ہے بلکہ جی چاہتا ہے کہ میں اسے ستانا چھوڑ دوں۔

صدائے غیبی: تو فاؤسٹ کو جانتا ہے؟

شیطان: کون وہ علامہ؟

صدائے غیبی: ہاں وہ ہماری بندگی کرنے والا۔

شیطان: بجا ہے! اچھی بندگی ہے۔ اس بے وقوف نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا ہے۔ اس کے دماغ میں جو سودا پک رہا ہے وہ اسے نہ جانے کہاں لے جائے گا۔ خود اسے بھی اپنی دیوانگی کا کچھ کچھ احساس ہے' وہ آسمان سے روشن ترین ستارے مانگتا ہے اور زمین سے بہترین روحانی نعمتیں' قریب و بعید کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اس کے اضطراب قلب کو تسکین ہو۔

صدائے غیبی: اگر وہ ابھی شک اور تاریکی میں ہماری بندگی کرتا ہے تو ہم بہت جلد اس کی آنکھوں سے پردے اٹھا دیں گے۔ باغبان جانتا ہے کہ جو پودا ہرا ابھرا ہے وہ آگے چل کو پھولے پھلے گا۔

شیطان: اچھا اسی بات پر شرط ہو جائے میں اسے اب بھی بہکا سکتا ہوں۔ اگر تیری اجازت ہو تو اسے رفتہ رفتہ اپنی راہ پر لگاؤں۔

صدائے غیبی: جب تک وہ دنیا میں ہے تجھے بہکانے کی ممانعت نہیں۔ جب تک انسان راہ طلب میں ہے اس کا بھٹکنا لازمی ہے۔

شیطان: میں تیرا شکر گزار ہوں۔ مُردوں سے بیوہار کرنے کا مجھے خود شوق نہیں۔ مجھے تو جیتا جاگتا انسان چاہیے' لاشوں سے بندہ کوسوں دور رہتا ہے مرے ہوئے چوہے سے بلی کو کیا کام۔

صدائے غیبی: اچھا یہ معاملہ تیرے سپرد ہے۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو اس کی روح کو مبداء اصلی سے ہٹا کر اپنے ساتھ شقاوت کے گڑھے میں لے جا ورنہ شرم سے سر جھکا کر یہ اعتراف کر:۔

نیک انسان کو نفسانیت کی ظلمت میں بھی راہ راست نظر آ جاتی ہے۔

شیطان: بہت خوب! یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میری شرط جیتی جتائی ہے لیکن اگر میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے اکڑنے اور اترانے کی اجازت ملے۔ بات تو جب ہے کہ وہ میری خالہ بہشت کی ناگن کی طرح شوق سے مٹی چاٹے۔

صدائے غیبی: جا تجھے اس کی اجازت ہے۔ مجھے تجھ ایسوں سے نفرت نہیں۔ تمام منکر خبیث روحوں میں مسخرا شیطان سب سے کم تکلیف دہ ہے۔ انسان کا دست عمل جلد سو جاتا ہے اور اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہم خوشی سے اسے تیرا مصاحب دیتے ہیں جو اسے بہلائے ابھارے اور شیطانی قوت تخلیق دے۔ لیکن اے خدا کے نیک بندو تم ہمیشہ حسن لایزال کے تصور میں مگن رہو۔ ابدی زندگی اور قوت تخلیق کو محبت کی نازک کمند میں باندھ لو۔ اس نیرنگ تغیرات کو لافانی معانی کی زنجیر میں جکڑ لو۔

(آسمان ہٹ جاتا ہے اور ملائک مقربین منتشر ہو جاتے ہیں)۔

شیطان: میں کبھی کبھی خوشی سے بڑے میاں کے سلام کو چلا آتا ہوں اور ان سے لڑائی مول لینے سے پرہیز کرتا ہوں کیسا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا بادشاہ شیطان تک سے انسانیت سے باتیں کرتا ہے۔

فاؤسٹ

رات کا وقت

(ایک چھوٹا سا گاتھک طرز کا کمرہ جس کی چھت لداو کی ہے۔ فاؤسٹ اپنی ڈیسک کے سامنے ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس پر بے چینی کی کیفیت طاری ہے)۔

فاؤسٹ: افسوس اے فاؤسٹ! تو نے فلسفہ' قانون اور طب کی خاک چھانی اور ستم تو یہ ہے کہ دینیات[1] میں بھی سر کھپایا مگر کمبخت سادہ لوح! تو جہاں تھا وہیں ہے۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ تو فاضل کہلاتا ہے بلکہ علامہ اور دس سال سے اپنے شاگردوں کو انگلیوں پر نچاتا ہے۔ حالانکہ تو جانتا ہے کہ علم انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔ ہائے یہ خیال مجھے سوہان روح ہو گیا ہے۔ مانا کہ میں ان مدعیان فضیلت سے ان عالموں' فاضلوں' مصنفوں اور ملاؤں سے زیادہ سمجھدار ہوں ان کے شکوک اور اوہام سے آزاد ہوں' جہنم اور شیطان سے نہیں ڈرتا لیکن اس روشنی طبع نے میری مسرتوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں اس خیال خام سے بھی دل کو بہلا نہیں سکتا کہ میں کچھ جانتا ہوں اور دوسروں کو سکھا سکتا ہوں اور میری ذات سے لوگوں کو فیض پہنچتا ہے۔ نہ میرے پاس مال و دولت ہے نہ عزت و جاہ۔ ایک کتا بھی ایسی زندگی برداشت نہ کرے گا۔ اس لیے اب فن ساحری کا مطالعہ کرتا ہوں کہ شاید ارواح کے ذریعے سے اور ان کی زبان سے کچھ بھید کھلے اور مجھے یہ ضرورت نہ رہے کہ بڑی شد و مد سے ان مسائل پر تقریر کروں جن کے سر پیر کی مجھے خبر نہیں۔ شاید میں اسی طرح کائنات کے اندرونی نظام سے واقف ہو جاؤں مبداء حیات اور قوت تخلیق کا مشاہدہ

---

1. جرمنی کی یونیورسٹی میں علوم و فنون کے چار شعبے ہوتے تھے۔ شعبہ فلسفہ (جس میں ادب' لسانیات' تاریخ' اجتماعیات' سائنس اور ریاضی شامل ہیں) شعبہ قانون' شعبہ طب اور شعبہ دینیات۔ ان چاروں کا ذکر کرنے سے یہ مراد ہے کہ فاؤسٹ نے کل علوم حاصل کیے تھے۔

کروں اور الفاظ کی خردہ فروشی پر لعنت بھیجوں۔

اے ماہ کامل کاش یہ آخری بار ہو کہ تو مجھے دیدہ ریزی اور مشقت سے آدھی رات کو اس دماغ سوزی میں مصروف دیکھے۔ اے میرے غمگین دوست' اب تک تیری کرنیں کتابوں اور کاغذوں کے حجاب سے گزر کر مجھ تک پہنچتی تھیں۔ کاش اب میں تیری پیاری روشنی میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر سیر کروں۔ روحوں کے دوش بدوش گہرے غاروں پر منڈلاؤں۔ تیری رندھی ہوئی چاندنی میں سرسبز چراگاہوں پر اڑتا پھروں اور علم کی خلش سے نجات پا کر شبنم میں نہاؤں اور جسم و روح کی صحت کا لطف اٹھاؤں۔

آہ میں کب تک اس قید خانے میں' اس منحوس کال کوٹھری میں بند رہوں گا جہاں دلفروز آسمانی روشنی بھی نقشی کھڑکیوں سے دھندلی ہو کر آتی ہے جہاں دیمک کی چاٹی گرد سے اٹی کتابوں کے ڈھیر لگے ہیں اور دھوئیں سے کالے کاغذ کے انبار چھت تک پہنچے ہیں جہاں سائنس کے آلات' بوتلیں' شیشیاں' ڈبے' صندوق' غرض باوا آدم کے زمانے کا سارا کاٹ کباڑ جمع ہے۔ دیکھ فاؤسٹ یہ ہے تیری دنیا! واہ کیا دنیا ہے۔

پھر بھی تو پوچھتا ہے کہ کیوں تیرا دل غم کے شکنجے میں دبا جاتا ہے اور کون سا درد پنہاں تیری رگوں میں خون کے بہاؤ کو روکتا ہے؟ اس جیتے جاگتے سنسار کو چھوڑ کر جس میں خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہاں مردوں کے پنجروں اور جانوروں کی ہڈیوں کے درمیان دھوئیں اور بدبو کی فضا میں سانس لیتا ہے۔

اٹھ جاگ خدا کی وسیع دنیا میں چل! کیا یہ پراسرار کتاب جو نسطر ادیم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے تیرے زادِ راہ کے لیے کافی نہیں؟ یہاں سے نکل کر تو ستاروں کی رفتار کو پہچانے گا اور فطرت کے فیض درس سے تجھے روحوں کی گفتگو سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوگا۔ یہاں تو مقدس نقوش کی تعبیر میں بے کار سر کھپاتا ہے۔ اے میرے گرد منڈلانے والی روحو! اگر تم میری آواز سنتی ہو تو جواب دو۔

(وہ کتاب کھولتا ہے کائنات اکبر کا نقش نظر آتا ہے)

واہ واہ! ایک نظر میں میرا دل و دماغ خوشی سے معمور ہو گیا۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ نشاط زندگی کی پاک لہر' شباب کی مستی لیے ہوئے بجلی کی طرح میرے رگ و ریشے میں دوڑ گئی۔ کیا کسی دیوتا نے یہ نقوش بنائے ہیں جن کی بدولت میری روح کو تسکین ہے اور میرا غریب بے کس دل

مسرت سے لبریز ہے۔ جن کی پراسرار تاثیر سے مجھے چاروں طرف فطرت کی قوتیں بے نقاب نظر آ رہی ہے۔ کیا میں بھی کوئی دیوتا ہوں؟ مجھے کیسی بصیرت حاصل ہو گئی ہے! ان پاک لکیروں میں مجھے فطرت کی کارسازیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ اب میں سمجھا حکیموں کا وہ قول "عالم ارواح میں کوئی حجاب نہیں۔ خود تیری آنکھیں بند ہیں اور تیرا دل مردہ اٹھ اے طالب اٹھ اور اپنے دل کی گرد کو دھو ڈال۔ اپنے جسم خاکی کو شفق صبح میں غسل دے۔"

سبحان اللہ! ہر جز کس ترتیب کے ساتھ کل کی تعمیر میں صرف ہوا ہے اور ہر ذرے کی حرکت اور زندگی کس خوش اسلوبی سے دوسرے ذرات سے وابستہ ہے۔ وہ دیکھو اجرام سماوی کس طرح تگاپو میں مصروف ہیں اور ایک دوسرے سے کسب نور کر رہے ہیں۔ ان کی روشن کرنیں آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی ہیں اور شمیم سعادت برسا رہی ہیں۔ ہر ایک کی نوائے زندگی نغمہ کائنات سے ہم آہنگ ہے۔ کیا دلفریب تماشا ہے! مگر افسوس! محض تماشا! اے نامحدود فطرت میری محدود نظر میں تیری بساط بس اتنی ہے۔ اے حیات کائنات کے سرچشموں جن پر زمین و آسمان کا دارومدار ہے آؤ میں تمہیں سینے سے لگاؤں، بتاؤ تم کہاں ہو؟ میرا تشنہ وصال سینہ تمہاری طرف کھچ رہا ہے۔ تم اُبلو تم سیراب کرو اور میں یوں پیاسا رہوں۔

(وہ بے دلی سے کتاب کا ورق الٹتا ہے۔ روح ارض کا نقش نظر آتا ہے)۔

اس نقش کا مجھ پر کچھ اور ہی اثر ہے۔ اے کرۂ زمین کی روح تو مجھ سے زیادہ قریب ہے۔ تجھے دیکھتے ہی میری قوتیں اُبھرنے لگیں اور مجھے ایک نئی شراب نے مست کر دیا۔ میرے دل میں یہ ہمت پیدا ہو گئی کہ دنیا کی جوکھم اپنے سر لے لوں اور زندگی کی رنج و راحت کا بوجھ اٹھا لوں، طوفان کا مقابلہ کروں اور کشتی کے ڈوبنے کی آواز سے نہ ڈروں۔

ارے! یہ کیا ہوا! میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ چاندنی چھپ گئی۔ چراغ نظر نہیں آتا۔ بخارات اٹھ رہے ہیں! میرے سر کے گرد روشنی کی سرخ کرنیں تڑپ رہی ہیں۔ ایک رعشہ سا چھت سے اتر کر مجھ پر طاری ہو گیا ہے۔ اے وہ روح جس کی میں منتیں کر رہا تھا مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تو میرے گرد منڈلا رہی ہے۔ آ" ظاہر ہو جا! ارے! میرا دل پھٹا جاتا ہے! میرے سارے حواس میں نئے احساسات کا طوفان برپا ہے۔ میرا دل تو نے تسخیر کر لیا ظاہر ہو! ظاہر ہو! چاہے میری جان پر بن جائے۔

(وہ کتاب کو بند کر دیتا ہے اور روح کا منتر پر اسرار طریقے سے پڑھتا ہے۔ ایک سرخ شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ شعلے میں سے روح ظاہر ہوتی ہے)۔

روح: مجھے کون بلاتا ہے؟

فاؤسٹ: (منہ پھیر کر) ہیبت ناک شکل!

روح: تو نے مجھے کھینچ بلایا ہے میرے کرے پر دیر سے کشش کا عمل کر رہا تھا۔ بول کیا چاہتا ہے۔

فاؤسٹ: اف! میں تیری تاب نہیں لاسکتا۔

روح: تو میری ملاقات کی میری شکل دیکھنے کی میری آواز سننے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ تیری مؤثر التجاؤں نے مجھے متوجہ کر لیا' میں آ گئی۔ واہ رے مافوق البشر تو' تو خوف سے لرز رہا ہے۔ اب وہ روح کی فریاد کہاں گئی؟ وہ قلب کیا ہوا جس سے اپنی دنیا الگ بنائی تھی اور اس کی پرداخت میں مصروف تھا۔ جو مسرت کی امنگ میں روحوں کی برابری کرنا چاہتا تھا۔ وہ فاؤسٹ' کہاں ہے جس کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی جس کی قوی کشش نے مجھے کھینچا تھا؟ کیا وہ تو ہی ہے جو میری سانس کو آندھی سمجھ کر تن بدن سے کانپ رہا ہے۔ واہ رے ڈرپوک سہمے ہوئے کیڑے!

فاؤسٹ: میں اے پیکر شعلہ! میں اور تجھ سے ڈروں؟ ہاں میں ہی وہ فاؤسٹ ہوں تیرا ہمسر!

روح: سیلاب ہست و بود میں، طوفان جدوجہد میں' ارض و سما میں منڈلاتی ہوں' شرق و غرب میں آتی جاتی ہوں! میں مہد بھی ہوں لحد بھی' ابدی سمندر ہوں' نیرنگ تغیر ہوں' شعلۂ حیات ہوں' زمانے کے راچھ پر تخلیق کے تانے بانے سے' قبائے زندگی بنتی ہوں جو معبود حقیقی کی پوشاک مجازی ہے۔

فاؤسٹ: اے وسعت کائنات میں پرواز کرنے والی' اے سرگرم عمل روح' مجھ میں اور تجھ میں کتنی مشابہت ہے!

روح: تو اس روح سے مشابہ ہے جس کا تو ادراک کر سکتا ہے۔ مجھ سے نہیں۔

(غائب ہو جاتی ہے)

فاؤسٹ: (گر پڑتا ہے) تجھ سے نہیں؟ میں شبیہ ذات ایزدی! تجھ تک سے مشابہ نہیں!

(کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے)

فاؤسٹ: ہائے غضب میں سمجھ گیا۔ یہ میرا مددگار[1] شاگرد ہے۔ اب میری ساری خوشی

---

1 جرمنی کی یونیورسٹیوں میں پروفیسر کسی لائق شاگرد کو اپنا مددگار بنا لیتے ہیں۔

رخصت ہوئی! کیا ستم ہے' میرے نظارہ ارواح میں آج اس خشک مزاج شب رو نے آ کر خلل ڈال دیا۔

(واگنر شب خوابی کے کپڑے پہنے داخل ہوتا ہے)

(فاؤسٹ طوعاً و کرہاً اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

واگنر: معاف فرمائیے گا میں نے آپ کو تحت لفظ پڑھتے سنا۔ یقیناً آپ کوئی یونانی المیہ پڑھ رہے تھے۔ میں بھی اس فن میں استفادہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کی آج کل بڑی قدر ہے۔ میں نے لوگوں کو اکثر اس کی تعریف کرتے سنا ہے۔ اس زمانے میں ایک مسخرا ایکٹر ایک پادری کو سبق دے سکتا ہے۔

فاؤسٹ: بشرطیکہ پادری بھی مسخرا ایکٹر ہو اور یہ بھی کبھی کبھی ہوتا ہے۔

واگنر: آہ جب انسان ایک طرح کے عجائب خانے میں بند کر دیا جائے اور دنیا کو بہ مشکل تعطیل کے دن دور سے بغیر دوربین کے دیکھتا ہو تو آخر وہ لوگوں پر اپنی تقریر سے کیسے اثر ڈالے؟

فاؤسٹ: اگر تمہارے دل میں درد نہیں اگر تمہارے الفاظ دل سے نکل کر سننے والوں کے دلوں کو تسخیر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو تمہیں ہرگز کامیابی نہ ہو گی۔ یوں تم بیٹھے لاسا لگایا کرو' دوسروں کا پس خوردہ کھاتے رہو' اپنے راکھ کے ڈھیر کو پھونک پھونک کر برائے نام چنگاریاں دہکاتے رہو' اور تعریف کا شوق ہے تو بچوں سے اور بندروں سے داد لیتے رہو مگر تمہاری بات لوگوں کے دلوں کو تبھی لگے گی جب تمہارے دل سے نکلے گی۔

واگنر: مقرر کی کامیابی تو محض طرز ادا پر موقوف ہے مجھے ایک عرصے سے اس کا احساس ہے مگر ابھی میں اس میں کچا ہوں۔

فاؤسٹ: ارے کمبخت ایمانداری کے ساتھ کامیابی کی سعی کر الو کی طرح گلا پھاڑنے سے کیا فائدہ۔ اگر انسان سمجھدار ہے اور مذاق سلیم رکھتا ہے تو بغیر خطابت کی باریکیوں کے اس کی تقریر خود بخود اچھی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بات تمہارے دل سے لگی ہے اور تم اسے کہنا چاہتے ہو تو الفاظ کی تلاش میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تمہاری شاندار تقریریں جن میں تم الفاظ کے موتی پروتے ہو اس کہر یلی ہوا کی طرح جو موسم خزاں میں سوکھے پتوں کو کھڑکھڑاتی ہے دلوں میں حرارت پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

واگنر: آہ! آرٹ وسیع ہے اور ہماری عمر تھوڑی ہے۔ میرا تو اکثر تنقیدی مشاغل کے دوران میں سر چکرا جاتا ہے اور دل دھڑکنے لگتا ہے۔ انسان کے لیے کتابوں کے ماخذ تک پہنچنا کس قدر دشوار ہے۔ غریب آدمی دور جاتا ہے کہ موت آجاتی ہے۔

فاؤسٹ: کیا کتاب وہ مقدس چشمہ ہے جس کے دھاروں سے تمہاری پیاس ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی؟ نہیں، سچی تسکین اور تقویت اگر حاصل ہوسکتی ہے تو اپنے دل سے......

واگنر: قصور معاف، گزرے ہوئے زمانوں کے خیالات کا مطالعہ کرنے اگلے وقتوں کے کسی حکیم کی نظر سے دنیا کو دیکھنے اور پھر اپنے عہد کی ترقیوں سے مقابلہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

فاؤسٹ: واہ کیا کہنا ہماری ترقیوں کا! ارے بھائی گزرے ہوئے زمانے ہمارے لیے مکتوب سربستہ کا حکم رکھتے ہیں ہیں جنہیں تم اگلے زمانے کے خیالات کہتے ہو۔ وہ ہمارے ہی عہد کے حضرات کا خیال ہے، جس کا عکس تاریخ میں نظر آتا ہے۔ ہماری تاریخیں کیا ہیں؟ ایک خواب پریشاں، جس سے ایک ہی نظر میں لوگوں کا دل اکتا جاتا ہے۔ فضولیات کا دفتر مہملات کا انبار زیادہ سے زیادہ کسی بڑے واقعہ یا ملکی مہم کی داستان یا سیانے پن کے مقولوں کا مجموعہ جو کٹھ پتلیوں کی زبان سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

واگنر: لیکن دنیا! انسان کا دل اور اس کا ذہن! اس کا تھوڑا بہت علم تو ہر شخص حاصل کرنا چاہتا ہے۔

فاؤسٹ: ہاں وہ جس کا نام ہم نے علم رکھا ہے! مگر کون کہہ سکتا ہے کہ بچے کا اصلی نام کیا ہے[1] جن معدودے چند لوگوں کو حقیقت کا کچھ علم حاصل ہوا وہ اپنی حماقت سے راز کو چھپا نہ سکے۔ انہوں نے عوام پر اپنے جذبات و مشاہدات ظاہر کردیئے اور لوگوں نے انہیں سولی پر چڑھا دیا یا آگ میں جلا دیا۔ مگر بھائی اب رات زیادہ آگئی۔ اس وقت یہ گفتگو ملتوی کرنا چاہیے۔

واگنر: میں تو خوشی سے تمام رات جاگنے کو تیار ہوں کہ آپ کے ساتھ یہ علمی مکالمہ جاری رہے۔ کل ایسٹر کا پہلا دن ہے آپ اجازت دیں تو صبح تڑکے حاضر ہو کر چند مسائل آپ سے حل کروں۔ میں نے تحصیل علم میں بڑی محنت کی ہے، میں نے بہت کچھ سیکھا مگر چاہتا ہوں کہ سب کچھ

---

1. جرمن زبان کی ایک ضرب المثل ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اصل حقیقت کی بجز کسی کو نہیں۔

سیکھ لوں۔

(چلا جاتا ہے)

فاؤسٹ: عجب بات ہے کہ اس شخص کو کبھی نا امیدی نہیں ہوتی جو سطحی چیزوں میں مشغول رہتا ہے وہ خزانے کی تلاش میں شوق سے مٹی کھودتا ہے اور کیچوے پا کر خوش ہو جاتا ہے۔

کیا ایسے شخص کو حق ہے کہ یہاں جہاں روحیں میرے گرد حلقہ کیے ہوئے تھیں گھس آئے اور اپنی بکواس شروع کر دے؟ مگر اس مرتبہ تو اسے بد بخت ترین انسان میں تیرا شکر گزار ہوں تو نے مجھے اس دہشت سے نجات دی جس سے میرے حواس جاتے رہتے۔ اُف! وہ شکل دیو کے برابر تھی اور میں اس کے سامنے بونا معلوم ہوتا تھا۔

میں شبیہ ایزدی' جو اپنے خیال میں حقیقت ابدی کے آئینے سے قریب تھا اور جسم خاکی کی آلائشوں سے پاک ہو کر صفائے قلب اور نور معرفت کے مزے لے رہا تھا میں جو اپنے آپ کو فرشتے سے برتر سمجھتا تھا جسے یہ گمان تھا کہ اس کی بے قید روحانی قوت فطرت کے رگ و ریشے میں دوڑتی ہے اور دیوتاؤں کی طرح تخلیق کا لطف اٹھاتی ہے اسی سزا کے قابل تھا۔ ایک ہی گرج میں میرے ہوش اڑ گئے۔

نہیں اے روح' مجھے تیری برابری کا منصب نہیں! مجھ میں تجھے بلانے کی قوت تو تھی مگر روکنے کی نہ تھی۔ اس مقدس لمحے میں مجھے اپنی برتری اور اپنی کمتری دونوں کا احساس ہوا تو نے مجھے انسانی تقدیر کے گڑھے میں دھکیل دیا جس کا کہیں اور ہے نہ چھور۔ مجھے کون بتائے؟ کیا کروں کیا نہ کروں؟ کیا میں اپنے دل کی لگی بجھانے کی کوشش کروں؟ آہ! ہمارے کام اور ہمارے آلام دونوں سفر حیات میں سنگ راہ ہیں۔

ہماری روح کو جو بے بہا نعمت ملی ہے اس میں اوپری چیزوں کا میل ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں دولت دنیا ہاتھ آتی ہے تو ہم روحانی برکتوں کو وہم اور دھوکہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اعلیٰ جذبات جو ہماری زندگی کا سرمایہ ہے دنیا کی کیچڑ میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔

اگر پہلے تخیل کی بلند پروازی امید کی قوت سے فضائے نامحدود کی محرم تھی تو اب اس کے لیے ایک تنگ دائرہ کافی ہے اور ساری امیدیں یکے بعد دیگرے زمانے کے بھنور میں ڈوبتی جاتی ہیں فکر و تردد نے دل میں گھر کر کے درد پنہاں کا جال پھیلا دیا ہے' اضطراب کا طوفان برپا ہے اور

راحت وسکون کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔ یہ فکریں نئے نئے روپ بدلتی ہیں۔ کبھی گھربار کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ کبھی بیوی بچوں کی' کبھی آگ کی' کبھی پانی کی' کبھی زہر کی' کبھی تلوار کی' تو ان ضربوں سے کانپتا ہے جو کبھی کارگر نہیں ہوتیں اور اس نعمت کو رویا کرتا ہے جو کبھی ضائع نہیں ہوسکتی۔

میں دیوتاؤں کا ہمسر نہیں! آہ! اس کا مجھے خوب احساس ہے میں ان کیڑوں کے مانند ہوں جو مٹی میں لتھڑے رہتے ہیں اور مٹی چاٹا کرتے ہیں جو رہرو کے پیروں میں کچل کر مٹی میں مل جاتے ہیں۔

کیا یہ اونچی دیواریں جن میں' میں قید ہوں بجز مٹی کی تہوں کے کچھ اور ہیں؟ اور یہ سارا کاٹ کباڑ یہ ہزار ہا بیکار چیزیں جنھوں نے مجھے اس کہنہ خاک دان' اس دیمک کی دنیا کا پابند کر رکھا ہے؟ کیا اس میں میرے درد کی دوا ملے گی؟ کیا میں اتنی بات معلوم کرنے کے لیے ہزاروں کتابیں پڑھوں کہ انسان ہمیشہ سے مصیبتیں جھیلتا آیا ہے اور کہیں لاکھوں میں ایک کو راحت نصیب ہوئی ہے؟ اے مردے کی کھوپڑی تو میری طرف دیکھ کر کیوں دانت نکالتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کسی دن تیرا دماغ بھی اسی طرح مختل تھا جیسے آج میرا ہے اور روز روشن کی تلاش میں مطلب حق کے خمار میں ظلمت جہل میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ اے سائنس کے آلات تم بھی میرا منہ چڑاتے ہو' تمہاری پھرکیاں اور دندانے' تمہارے پرزے اور کمانیاں مجھ پر ہنستی ہیں: میں سمجھتا تھا کہ میں حقیقت کے دروازے پر کھڑا ہوں اور تم اس کی کنجی ہو' تمہاری ساخت تو بڑی پیچدار ہے مگر قفل کا کھٹکا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نظام فطرت دن کی روشنی میں بھی ایک راز سربستہ ہے اور جو حقیقت تیرے ذہن پر خود بخود منکشف نہ ہو اس پر بیرم اور پیچ کا زور نہیں چلتا۔ اے پرانی بیکار چیزو' میں نے تم سے کبھی کام نہیں لیا' تم یہاں اس لیے پڑی ہو کہ میرا باپ تمہیں استعمال کرتا تھا۔ اے دقیانوسی جھلی کے خریطو' جب تک اس ڈیسک پر یہ دھندلا لیمپ ٹمٹماتا ہے تم دھوئیں سے سیاہ ہوتے رہو گے۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی ان چھوٹی چیزوں کے انبار میں محنت اور عرق ریزی میں نہ کھوتا۔ باپ دادا کا ورثہ لے تو اس کا اہل بھی بن۔ جو چیز کام نہ آئے وہ ایک بھاری بوجھ ہے کام کی چیز وہی ہے جو موجودہ تخلیق کا موضوع ہو۔

یہ کیا بات ہے کہ میری نظر اس کونے پر جمی ہے؟ کیا یہ اس شیشے کی مقناطیسی قوت ہے؟ میری آنکھوں میں دفعتاً یہ جانفروز روشنی کیوں آ گئی' مجھے اندھیری رات میں گھنے جنگل میں یکا یک سپیدہ

صبح نمودار ہو جائے؟

میرا اسلام ہو تجھ پر اے بے نظیر شیشے! میں تجھے ادب سے اٹھاؤں گا تو انسانی حکمت اور صناعی کا قابلِ احترام نمونہ ہے۔

اے نیند کی دلفریبیوں کی روح' اے موت کی نزاکتوں کے جوہر اپنے مالک کی مدد کر۔ تجھے دیکھتے ہی درد کی خلش کم ہو گئی۔ تجھے چھوتے ہی اضطرابِ قلب کو سکون سا ہو گیا؟ میری روح میں جو طوفان برپا تھا رفتہ رفتہ فرو ہو رہا ہے۔ میں بحرِ بیکراں میں بہا چلا جا رہا ہوں' سمندر کی سطح میرے قدموں کے نیچے چمک رہی ہے' نیا دن مجھے نئے ساحل دکھا کر للچا رہا ہے۔

ایک آتشیں بگھی ہوا میں نمودار ہے اور سبک روی سے میرے پاس آ رہی ہے۔ میں تیار ہوں کہ نئی شاہراہ پر سفر کروں اور چرخِ اثیر سے گزر کر ان نامعلوم کروں میں پہنچوں جہاں حرکتِ محض کا دور دورہ ہے۔ اللہ اللہ! یہ بلند و برتر زندگی' یہ ملکوتی مسرت! اے زمین کے کیڑے تو اور یہ مراتب؟ ہاں اپنے عزم کو استوار کر لے اور اس ناسوتی سورج سے منہ پھیر لے! تیار ہو جا' ان دروازوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جن کے پاس سے لوگ دبے پاؤں گزر جاتے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ تو اپنے عمل سے انسان کو دیوتاؤں کا ہمسر ثابت کر دے۔ ان تیرہ و تار بلندیوں سے نہ ڈرے جہاں تخیل کے پر جلتے ہیں اور اس گزرگاہ کی طرف پرواز کرے جس کے تنگ دروازے پر جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ اس مہم کے لیے ہنستا کھیلتا کمر بستہ ہو جا چاہے اس میں قعرِ عدم میں گر جانے کا خطرہ ہو۔

آ اے شفاف بلوری ظرف جس پر برسوں سے میری نظر نہیں پڑی تھی' اپنے چوبی خول سے نکل۔ تو بزرگوں کے خوانِ طرب کی رونق تھا۔ دست بدست پھر کر دل گرفتہ مہمانوں کو سرور بخشتا تھا۔ تیرے دل فریب نقش و نگار کمالِ صنعت کا نمونہ ہیں' انہیں دیکھ کر مجھے جوانی کی راتیں یاد آتی ہیں جب ہر پینے والے کا فرض تھا کہ ان تصویروں پر شعر کہے اور ایک گھونٹ میں شیشے کا شیشہ چڑھا جائے' اس وقت میں تجھے کسی ہم نشیں کی طرف نہ بڑھاؤں گا' تیری صناعی پر طبع آزمائی نہ کروں گا' تیرے جوف میں ایک زعفرانی عرق ہے جو چشم زدن میں مست کر دیتا ہے۔ یہ میری کشید ہے اور میری پسند۔ اب میں دل و جان سے یہ آخری جام صبحِ عید کی تکریم میں پیتا ہوں۔

(شیشے کو منہ سے لگاتا ہے)

(گھنٹیاں بجتی ہیں اور کورس کا گانا ہوتا ہے)

فرشتوں کا کورس

مسیح پھر جی اٹھا!
مژدہ ہو فانی انسانوں کو
جو مہلک گناہوں میں،
موروثی شب روخطاؤں میں
ہر طرف سے گھر ہوئے ہیں۔

فاؤسٹ: یہ کیسی دلکش نشید ہے، کیسا جاں فزا نغمہ ہے جو میرے منہ سے اس شیشے کو چھینے لیتا ہے؟ اے گھنٹیوں کی آواز کیا تو ابھی سے مبارک ایسٹر منانے لگی؟ اے 'سنگتو' کیا تم وہی تسکین بخش گیت گا رہی ہو جو ایک بار شب تاریک میں ایک قبر کے بالیں پر فرشتوں کی زبان سے عہد رحمت کی تجدید کر رہا تھا۔

عورتوں کا کورس

ہم دوا دارو سے
اس کی خدمت کرتے،
خلوص اور عقیدت سے
اسے نرم بچھونے پر لٹاتے
اس کے زخموں پر سلیقے سے
صاف ستھری پٹیاں باندھتے
مگر افسوس! اب مسیح
ہمارے درمیان نہیں

فرشتوں کا کورس

مسیح پھر جی اٹھا

مبارک ہے وہ عاشق
جو پاک کرنے والے صبر آزما
آلام ومصائب کے
امتحان میں پورا اترا

فاؤسٹ: اے دھیمے اور اثر میں ڈوبے ہوئے آسمانی نغمے تو مجھ خاک بسر سے کیا توقع رکھتا ہے؟ وہاں جا جہاں نرم دل والے لوگ جمع ہوں۔ میں تیرے پیام کو تو سنتا ہوں مگر کیا کروں میرا دل عقیدے سے خالی ہے: معجزہ عقیدت کی گود کا پالا ہے۔ میں اس روحانی فضا میں پرواز کی جرأت نہیں رکھتا جہاں سے یہ مبارک مژدہ آیا ہے مگر میں اس کے سننے کا بچپن سے عادی ہوں اور اس وقت بھی یہ مجھے نئی زندگی کی دعوت دے رہا ہے۔ پہلے مجھے یوم الست کی سنجیدہ خاموشی میں رحمت الٰہی پیار کیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں گھنٹیوں کی دلکش آواز اسرار الٰہی خزانہ معلوم ہوتی تھی اور عبادت الٰہی دل کو ذوق وشوق اور مسرت سے معمور کر دیتی تھی' کوئی مبارک نامعلوم آرزو مجھے جنگلوں اور لالہ زادوں میں کھینچ لے جاتی تھی اور گرم آنسو رخساروں پر بہہ کر ایک نئی دنیا کا احساس پیدا کرتے تھے۔ یہ گیت جو اس وقت گایا جا رہا ہے بچپن کے جاں بخش کھیلوں اور بہار کی آزاد مسرتوں کا پیام لاتا تھا؟ ان گھڑیوں کی یاد بچپن کے احساسات کو تازہ کر کے' مجھے آخری خطرناک قدم اٹھانے سے روک رہی ہے۔ بجے جاؤ اے آسمان کے نغمہ شیریں کی گیت! میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ مجھے زمین نے پھر اپنا کر لیا۔

لڑکوں کا کورس

آغوش قبر کا مدفون
عظمت وجلال سے
پھر اٹھ کھڑا ہوا
زندگی کا لطف اٹھاتا ہے
تخلیق کے مزے لیتا ہے
آہ! ہم زمین کی گود میں

ہدف مصائب ہیں
وہ اپنوں کو پردیس میں
چھوڑ کر چلا گیا
ہائے! اے آقا ہم
تیری خوش قسمتی پر روتے ہیں

فرشتوں کا کورس

مسیح پھر جی اٹھا!
موت کے آغوش سے!
اپنی اپنی زنجیروں کو
خوشی خوشی توڑ دو!
اس کی ثنا کرنے والو،
محبت کا دم بھرنے والو،
مل جل کر کھانے والو،
اس کا پیام سنانے والو،
رحمت کی بشارت لانے والو،
تمہارا آقا تم سے قریب ہے،
تمہارے لیے موجود ہے،
شہر کے پھاٹک کے سامنے
(ہر طرح کے لوگ پھاٹک سے نکل کر جا رہے ہیں)
چند نوجوان دستکار: ادھر کہاں چلے؟
دوسرے: ہم شکاری کے گھر کی طرف جاتے ہیں۔
پہلے: ہم تو پن چکی کی طرف جائیں گے
ایک نوجوان دستکار: بھائی ہماری صلاح تو یہ ہے کہ "واسر ہوف" کی سرائے میں چلو۔

دوسرا: ادھر کا رستہ خوشنما نہیں۔

___ تم کیا کرو گے؟

تیسرا: جہاں سب جائیں گے میں بھی جاؤں گا۔

چوتھا: آؤ برگ ڈورف کی سرائے کی طرف چلیں، وہاں خوبصورت لڑکیاں جمع ہوں گی۔ بیئر[1] بڑی اچھی ملے گی اور بڑی سیریں دیکھنے میں آئیں گی۔

پانچواں: اب تو بھی بڑا رسیا ہے، کیا پھر تیسری بار سر کھجایا ہے؟ میں تو وہاں نہیں جانے کا۔ مجھے اس جگہ کے نام سے جاڑا چڑھتا ہے۔

خادمہ: نہیں، نہیں! میں تو شہر کو واپس جاتی ہوں۔

دوسری: یقین مان وہ چنار کے پیڑوں کے پاس ملے گا۔

پہلی: تو مجھے کون سے لڈو مل جائیں گے، وہ تیرے ساتھ سیر کرے گا، تجھے لے کر میدان میں ناچے گا۔ مجھے تیرے دوستوں سے کیا غرض؟

دوسرا: آج وہ اکیلا نہیں ہوگا کہتا تھا کہ اس جوان کو آج ضرور لاؤں گا جس کے گھونگھر والے بال ہیں۔

مدرسے کا لڑکا: اُف! البیلی چھوکریاں کتنی تیز چلتی ہیں۔ آؤ ذرا قدم بڑھاؤ نہیں تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ زوردار بیئر ہو، خوب کڑوا تمباکو ہو اور ایک بنی ٹھنی چھوکری ساتھ ہو مجھے تو بس اس میں مزا آتا ہے۔

شریف لڑکیاں: ذرا دیکھنا ان حسین لڑکوں کو! انہیں شرم بھی نہیں آتی کیا ان کی ہمراہی کو اچھی لڑکیاں نہیں ملتی تھیں جوان چھوکریوں کے پیچھے پھر رہے ہیں۔

دوسرا مدرسے کا لڑکا (پہلے سے): اتنے تیز نہ چلو! پیچھے دو لڑکیاں آ رہی ہیں وہ بڑے اچھے کپڑے پہنے ہیں ان میں سے ایک میری ہم سایہ ہے۔ میرا اس پر دل آ گیا ہے۔ دونوں بڑی نستعلیق چال سے چل رہی ہیں مگر دیکھنا تھوڑی دیر میں ہمارے ساتھ چلیں گی۔

پہلا: نہیں بھائی صاحب! میں ایسے جھگڑے میں نہیں پڑتا، تیز چلو نہیں تو شکار جاتا ہے جو ہاتھ سنیچر کو جھاڑو دیتے ہیں ان سے زیادہ گرم جوشی سے اتوار کو مصافحہ کون کرے گا۔

---

1. ایک قسم کی شراب جو اناج سے بنائی جاتی ہے۔

شہری: مجھے یہ نیا میر مجلس ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اپنی میر مجلسی کے زعم میں وہ روز بروز بے باک ہوتا جاتا ہے اور یہ تو بتایئے آخر وہ شہر کے لیے کرتا کیا ہے؟ شہر کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ پہلے کبھی اتنی سختی نہ تھی اور نہ اتنا محصول دینا پڑتا تھا۔

فقیر: او نیک بابا اور سندر بی بی! تم بڑھیا کپڑے پہنے ہو اور تمہارے گالوں پر سرخی ہے، دم بھر ٹھہر کر میری مصیبت دیکھو اور میری مدد کرو۔ میں یہاں بیٹھا بین بجاتا ہوں۔ میرے سوال کو نہ ٹالو۔ جو سخی داتا فقیر کو بھیک دیتا ہے اس کا کلیجہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ آج ساری دنیا عید مناتی ہے۔ فقیر کا بھی آج بھلا ہو جائے۔

دوسرا شہری: اتوار کے اور تہوار کے دن لڑائی کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ فرض کرو یہاں سے دور ترکوں کے ملک میں خوب تلوار چل رہی ہے، تم دریا کے کنارے سرائے کی کھڑکی میں ہاتھ میں جام لیے کھڑے ہو، سامنے دریا میں طرح طرح کی کشتیاں سپاہیوں سے بھری چلی آ رہی ہیں، تم شام کو خوش خوش لوٹ کر گھر آتے ہو اور اپنے ملک کے امن کو دعائیں دیتے ہو۔

تیسرا شہری: ہاں میاں ہم سائے میرا بھی یہی خیال ہے، پردیس میں چاہے جتنا خون بہے اور تباہی آئے اپنے دیس کی خیر رہے۔

بڑھیا (شریف لڑکیوں سے): واہ وا! کیا ٹھاٹھ ہیں! خدا جوانی کو سلامت رکھے! بھلا کون ہے جو تم پر لوٹ نہ ہو جائے گا۔ مگر اتنا غرور کیوں! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے دل کی مراد حاصل ہوگی۔

شریف لڑکی: چل اگاٹے چل، میں لوگوں کے سامنے ایسی چڑیلوں کے ساتھ نہیں چلتی۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ اس نے انڈریاس کی رات کو مجھے میرا ہونے والا عاشق جیتا جاگتا دکھا دیا تھا۔

دوسری: مجھے اس نے بلور میں دکھایا تھا۔ سپاہیوں کی سی سج دھج والا، بانکوں کے حلقے میں! میں اسے ہر جگہ تلاش کرتی ہوں مگر وہ کہیں ملتا ہی نہیں۔

سپاہی

اونچی دیواروں والے کوٹ
بلند کنگروں والے قلعے،

نازو انداز والی لڑکیاں
جیتنے کی دھن ہے!
کام بھی ہے جیوٹ کا'
انعام بھی شاندار ہے!
ہماری تری بجتی ہے'
خوشی ہو یا تباہی ہو۔
اس کا نام مہلہ ہے!
اس کو زندگی کہتے ہیں!
قلعوں کو اور لڑکیوں کو
زیر ہونا پڑتا ہے!
کام بھی ہے جیوٹ کا'
انعام بھی شاندار ہے!
سپاہی فتح کرتے ہیں'
اور اپنی راہ لیتے ہیں۔

فاؤسٹ اور واگنر

فاؤسٹ: بہار کی دلکش اور جانفزا نظر نے برف میں جکڑے ندی نالوں کو آزاد کر دیا ہے، وادیوں میں امید و مسرت کا سبزہ لہلہا رہا ہے، پیرِ زمستاں ضعف سے لڑکھڑاتا ہوا بے برگ و گیاہ پہاڑوں میں لوٹ گیا ہے جاتے جاتے وہ اگتے ہوئے سبزے کی زمردیں سطح پر برف کے چھوٹے چھوٹے دانوں کی ہلکی سی بوچھاڑ کر گیا ہے جس سے ہر فرش پر سفید دھاریاں بن گئی ہیں مگر سورج کو سفیدی کی برداشت نہیں وہ ہر جگہ سعی و نمو کو ابھارنا اور ہر چیز میں شوخ رنگوں سے جان ڈالنا چاہتا ہے پھول تو ابھی تک سطح زمین پر نظر نہیں آتے مگر ان کی جگہ انسان ہیں گوناگوں لباس میں۔ اچھا اب ذرا پلٹ کر اس بلندی سے شہر کی طرف نظر ڈالو۔ ہیبت ناک بوسیدہ پھاٹک سے رنگ برنگ کے لوگ چلے آتے ہیں۔ آج ہر شخص ہوا کھانے نکلا ہے۔ وہ مسیح کے قبر سے نکلنے کی خوشی مناتے ہیں کیونکہ وہ خود قبروں سے نکلے ہیں۔ نیچے مکانوں کے اندھیرے کمروں سے، کام کاج کی قید سے، چھتوں اور دیواروں کے خلجان سے، تنگ گلیوں کی اُمس سے، گرجوں کی عبادت شبانہ سے، کھلی ہوا اور روشنی میں۔ دیکھو، دیکھو کتنی تیزی سے مجمع چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر باغوں اور کھیتوں میں پھیل گیا ہے جیسے کسی دریا کے طول و عرض میں بجرے مستانہ وار چل رہے ہوں۔ اور اب یہ آخری کشتی مسافروں سے لدی جا رہی ہے۔ پہاڑ کی پگڈنڈیوں پر دور دور تک رنگین کپڑوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گاؤں سے دھما چوکڑی کی آواز آ رہی ہے۔ یہی ہے غریبوں کی سچی بہشت، چھوٹے بڑے خوشی کے نعرے لگا رہے ہیں، یہاں میں انسان ہوں۔ میں انسان ہو سکتا ہوں۔

واگنر: اے علامہ محترم، آپ کی ہمراہی میں سیر کرنا باعث فخر اور موجب فیض ہے۔ مگر میں اکیلا ہوتا تو یہاں کبھی اپنی اوقات ضائع نہ کرتا کیونکہ مجھے گنوار پن سے سخت نفرت ہے۔ یہ سارنگی کی آواز یہ شور و غل، لہو و لعب میرے لیے سامعہ خراش ہے، ان لوگوں نے وہ دھما چوکڑی مچا رکھی ہے گویا

شیطان ان میں حلول کر گیا ہے اور اس کا نام جشن مسرت اور نغمہ و سرود رکھا ہے۔ (لیموں کے درخت کے نیچے کسان جمع ہیں ناچ گانا ہو رہا ہے)

چرواہا بن سنور کر ناچنے چلا
رنگین کپڑے، ریشمی فیتے
اور گلے میں پھولوں کا ہار
سر سے پاؤں تک چھیلا بنا
ہاہاہا! ہاہاہا!
تاک دھنا دھن تاک دھنا دھن!
طبلہ بجتا جاتا ہے؛
وہ مجمع میں گھس پڑا
ایک لڑکی کو کہنی ماری
شوخ چھوکری مڑ کر کہتی ہے
کیوں رے کیسا مورکھ ہے!
ہاہاہا! ہاہاہا!
تاک دھنا دھن! تاک دھنا دھن
ارے تو بڑا نٹ کھٹ ہے!
جا اپنے ڈورے کسی اور پر ڈال!
بہتیروں نے اپنی منگیتر کو
جھوٹے پریم سے دغا دی ہے!
مگر وہ خوشامد در آمد سے
اس کو لے کر چلتا ہوا!
ہاہاہا! ہاہاہا!
تاک دھنا دھن! تاک دھنا دھن!
خوشی کے نعرے طبلہ کی تمک

ایک بوڑھا کسان: ڈاکٹر صاحب' آپ کی بڑی کرپا ہے جو آپ نے ہمیں اس لائق سمجھا اور اتنے بڑے عالم ہو کر ہم گنواروں میں چلے آئے' لیجئے یہ خوبصورت پیالہ لیجئے جس میں ہم نے تازی شراب بھر دی ہے۔ میں یہ آپ کے لیے لایا ہوں اور پکار کے دعا مانگتا ہوں کہ اس سے نہ صرف آپ کی پیاس کو تسکین ہو بلکہ اس میں جتنے قطرے ہیں اتنے ہی سال آپ کی عمر میں بڑھ جائیں۔

فاؤسٹ: میں اس آب حیات کو خوشی سے لیتا ہوں اور تمہارے شکریئے اور دعا کے بدلے میں تمہارا شکر گزار اور دعا گو ہوں۔

(لوگ فاؤسٹ کے آس پاس ایک حلقے میں جمع ہو جاتے ہیں)

بوڑھا کسان: سچ مچ یہ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ آج خوشی کے دن یہاں چلے آئے۔ مصیبت کے دنوں میں تو ہمیشہ ہی آپ نے ہمیں سہارا دیا۔ ابھی بہت سے لوگ جیتے ہیں اور یہاں موجود ہیں جنہیں آپ کے والد نے بخار کی آگ سے بچایا تھا' انہوں نے وبا کی روک تھام کی تھی۔ آپ ان دنوں نوجوان تھے اور ان کے ساتھ بیماروں کے گھر جایا کرتے تھے۔ لاشوں پر لاشیں نکلتی تھیں مگر آپ صحیح سلامت رہے' بڑی کڑی جانچ میں پورے اترے' غریبوں کی مدد کرنے والے کی اس پروردگار نے مدد کی۔

سب مل کر: خدا اس سچے محسن کو سلامت رکھے جس سے وہ ہماری مدد کرتا رہے۔

فاؤسٹ: اس آسمان والے کے آگے سر جھکاؤ جو مدد کرنا سکھاتا ہے اور غیب سے مدد کرتا ہے۔

(وہ واگنر کے ساتھ آگے چلا جاتا ہے)

واگنر: اے عظیم الشان ہستی' عوام کے اظہار عقیدت سے تیرے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو اپنے خداداد کمال سے۔ یہ فائدہ اٹھاتا ہو۔ باپ اپنے بچے کو لا کر تجھے دکھاتا ہے ہر شخص دوڑ آتا ہے اور تجھ سے ہدایت طلب کرتا ہے' سارنگی رک جاتی ہے' ناچنے والا تھم جاتا ہے۔ جب تو چلتا ہے تو لوگ قطار باندھے کھڑے رہتے ہیں اور ٹوپیاں اچھالی جاتی ہیں: بس ذرا سی کسر رہ جاتی ہے کہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں اور تجھے اپنا معبود سمجھیں۔

فاؤسٹ: چند ہی قدم پر وہ چٹان ہے جس پر بیٹھ کر ہم اس مشی کے بعد آرام کرنا چاہتے

تھے۔بار ہا میں اکیلا اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا اس چٹان پر بیٹھا رہتا تھا اور روزے نماز سے نفس کو مارا کرتا تھا۔میرا سینہ امید سے معمور رہتا تھا اور دل عقیدے سے قوی۔ میں سمجھتا تھا کہ آنسو بہانے' آہ سرد کھینچنے اور کف افسوس ملنے سے آسمان کا مالک مجبور ہو جاتا ہے۔لوگوں کی تعریف اس وقت میرے کانوں کو طعن و تشنیع معلوم ہو رہی تھی۔کاش تم میرے دل کی حالت جانتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ہم باپ بیٹے ہرگز اس تعریف کے مستحق نہیں! میرا باپ ایک بھلا آدمی تھا جسے نیرنجات کا شوق تھا اور وہ بڑے خلوص سے مگر انوکھے طریقے سے فطرت کے پاک نظام کے مشاہدے میں سر کھپایا کرتا تھا۔وہ دوسرے پکے ساحروں کے ساتھ اپنی جادو کی کوٹھری میں بند رہتا تھا اور خدا جانے کن کن نسخوں سے ان میل چیزوں کو ملا کر ناپاک ہانڈیاں پکایا کرتا تھا۔شیر کا لال گوشت' سوسن کے پتوں کے نیم گرم پانی میں ڈال کر تیز آنچ میں جوش دیا جاتا تھا اور پھر یہ خوش رنگ مرکب شیشوں میں بھرا جاتا تھا۔یہی وہ دوا تھی جسے پی کر مریض مرتے تھے اور یہ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ کوئی اچھا بھی ہوا یا نہیں۔ ہمارے یہ شیطانی علاج جو وبا سے بدر جہا بدتر تھے ان پہاڑوں اور وادیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔میں نے خود یہ زہر ہزار ہا آدمیوں کو بانٹا ہے۔وہ سب مر گئے اور مجھے یہ دن دیکھنا پڑا کہ آج بے باک قاتلوں کی تعریف ہوتی ہے۔

واگنر: اس سے آپ اتنے ملول کیوں ہوتے ہیں! کیا ایک بھلے آدمی کے لیے یہ کافی نہیں کہ جو فن اس نے حاصل کیا ہے اسے دیانتداری اور باضابطگی سے عمل میں لائے۔نوجوانی میں انسان اپنے باپ سے عقیدت رکھتا ہے اس لیے جو کچھ اس سے ملتا ہے ادب سے لے لیتا ہے۔ باپ اپنی زندگی میں جو کوشش کرتا ہے بیٹا اس سے فائدہ اٹھا کر علوم کو ترقی کے بلند تر درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

فاؤسٹ: خوش قسمت ہے وہ شخص جس کے دل میں اس غلطیوں کے بھنور سے نکلنے کی امید باقی ہے! انسان کو اسی کی ضرورت ہے جو وہ نہیں جانتا اور جو کچھ وہ جانتا ہے کسی کام نہیں آتا۔خیر اب اس ذکر کو چھوڑ دو' ایسے سہانے وقت کو اس کوفت میں برباد نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں سبز میدان کے آغوش میں وہ جھونپڑیاں کیسی چمک رہی ہیں۔سورج آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ہمارا دن ختم ہو گیا اب وہ کہیں اور جا کر نئی زندگی کا پیام سنائے گا۔ کاش میں پر پرواز رکھتا اور زمین سے اڑ کر ہمیشہ اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا! تب مجھے شفق شام کی

ابدی روشنی میں ساری دنیا اپنے قدموں میں نظر آتی۔ ہر پہاڑ آگ میں دہکتا ہوا' ہر وادی سکون میں ڈوبی ہوئی' روپہلی ندی سمندر کی سنہری دھار میں گرتی ہوئی۔ تب میری دیوتاؤں کی سی پرواز کو نہ سربفلک پہاڑ روک سکتے اور نہ دشوار گزار گھاٹیاں۔ ذرا سی دیر میں میری حیرت زدہ آنکھوں کو دفعتاً سمندر اپنی کھاڑیوں سمیت موجیں مارتا نظر آتا۔ لو سورج تو بالکل ڈوبا جاتا ہے اور میرے دل میں یہ نئی لہر اٹھی ہے کہ اڑ کر اس کے ساتھ جاؤں اور اس کی ابدی روشنی کو شراب کی طرح پیوں۔ آگے دن ہو' پیچھے رات' اوپر آسمان' نیچے سمندر۔ میں یہ خواب ہی دیکھتا رہوں گا اور وہ آنکھوں سے چھپ جائے گا۔ آہ! خاکی انسان کے لیے روحوں کے دوش بدوش پرواز کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کی فطرت میں ہے کہ اس کے دل کے جذبات آگے کی طرف بڑھیں اور اوپر کی طرف اٹھیں۔ دیکھو کوا نیلگوں فضا میں گم ہو کر اپنا دل دوز گیت گاتا ہے۔ عقاب بلند بالا صنوبر سے اونچا اڑ کر پر پھیلائے ہوئے میدانوں اور سمندروں پر منڈلاتا ہے' یہاں تک کہ سارس بھی اپنے وطن کی طرف لوٹنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔

واگنر: میرے قلب پر اکثر عجیب و غریب واردات گزرتی ہے لیکن ایسی لہر میرے دل میں کبھی نہیں اٹھی۔ آدمی ویسے ہی جنگلوں اور کھیتوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتا ہے۔ مجھے پرندوں کے پنکھ پر رشک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھلا اس پرواز کا مطالعے کی روحانی مسرتوں سے کیا مقابلہ جہاں ہمارا ذہن کتاب کتاب' ورق ورق' سیر کرتا پھرتا ہے۔ اس شغل میں جاڑوں کی بھاری راتیں پھول کی طرح ہلکی اور خوشنما معلوم ہوتی ہیں اور تمام اعضا کو سعادت کی زندگی اور حرارت بخشتی ہیں۔ واللہ! جہاں ایک اچھی کتاب کھولی معلوم ہوا سارا آسمان آنکھوں کے سامنے ہے۔

فاؤسٹ: تمہارے دل میں ایک ہی لہر ہے خدا نہ کرے دوسری اٹھے۔ آہ! میرے سینے میں دو روحیں ہیں اور ان دونوں میں نہیں بنتی۔ ایک تو کثیف لذتوں کے شوق میں دنیا سے چمٹی ہوئی ہے اور دوسری کو کد ہے کہ مجھے خاک سے اٹھا کر اس عالم پاک میں لے جائے جو میرے بزرگوں کی روحوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اگر ہوا میں روحیں ہیں جو زمین و آسمان کے درمیان براجتی ہیں تو کاش وہ اپنے سنہرے بادلوں سے اتریں اور مجھے نئی رنگا رنگ زندگی بسر کرنے کے لیے لے جاتیں! کاش میرے پاس جادو کا لباس ہوتا اور مجھے اڑا کر پردیس کے ملکوں میں پہنچاتا! بیش قیمت خلعتوں کا تو کیا ذکر ہے میں اسے ملبوس شاہی کے عوض میں بھی نہ بیچتا۔

واگنر: ان جانی پہچانی آسیبی روحوں کو نہ بلایئے جو کرہ ہوا میں بھری پڑی ہیں۔ یہ انسان کے سر پر دنیا کے چاروں کھونٹ سے بلائیں لاتی ہیں۔ شمال سے یہ روحیں تیر کی طرح گرتی ہیں اور جسم میں پیوست ہو جاتی ہیں' مشرق سے کھیتی کو سکھاتی آتی ہیں اور پھیپھڑوں کو جلا دیتی ہیں۔ جنوب کے صحراؤں سے یہ غول بیابانی کے مانند جھپٹتی ہیں اور گرمی کی تپش سے بھیجا پکا دیتی ہیں' مغرب سے ان کے پرے کے پرے دوڑتے ہیں اور پہلے تو جسم و روح کو تازگی پہنچاتے ہیں مگر پھر انسان کو کھیتوں کو چراگاہوں کو ڈبو کر چھوڑتے ہیں۔ وہ ہماری باتیں شوق سے سنتی ہیں کیونکہ انہیں ستانے کا شوق ہے۔ ہمارا کہنا خوشی سے مانتی ہیں کیونکہ ہمیں فریب دینے میں انہیں خوشی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو آسمان سے اترے ہوئے فرشتے ظاہر کرتی ہیں اور فرشتوں کے سے معصومانہ لہجے میں جھوٹ بولتی ہیں۔ چلیے اب گھر چلیں دنیا پر تاریکی چھا گئی ہے۔ ہوا سرد ہو گئی ہے اور پالا پڑ رہا ہے گھر کی قدر شام کو معلوم ہوتی ہے۔ آپ کسی چیز پر حیرت سے نظر جمائے ہیں؟ اس اندھیرے میں کون سی ایسی دلکشی ہے؟

فاؤسٹ: تم نے دیکھا وہ کالا کتا کھیتوں میں چکر کھاتا چلا آ رہا ہے؟

واگنر: میں دیر سے دیکھ رہا ہوں مگر مجھے اس میں کوئی اہمیت نہیں معلوم ہوئی۔

فاؤسٹ: ذرا غور سے دیکھو تم اسے کیا سمجھتے ہو؟

واگنر: میں اسے جھبرے بالوں والا کتا سمجھتا ہوں جو اپنے مالک کا نشانِ قدم تلاش کر رہا ہے۔

فاؤسٹ: تم دیکھتے ہو وہ گھونگے کی طرح لمبے لمبے چکر کاٹ رہا ہے اور ہم سے قریب آتا جاتا ہے۔ اگر میری نظر غلطی نہیں کر رہی ہے تو راہ میں اس کے پیچھے پیچھے آتشیں حلقے بنتے جاتے ہیں۔

واگنر: مجھے تو سوا کالے کتے کے کچھ نظر نہیں آتا۔ غالباً آپ کی نظر کا دھوکا ہے۔

فاؤسٹ: اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جادو کے پھندے بنا رہا ہے جن میں آگے چل کر ہمارے پیر پھنس جائیں۔

واگنر: اب وہ ہماری طرف جھپٹا لیکن ڈرتا جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے مالک کے بجائے دو اجنبی نظر آ رہے ہیں۔

فاؤسٹ: دائرہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے اب وہ قریب آ گیا۔

واگنر: دیکھا آپ نے معمولی کتا ہے' بھوت ووت کچھ نہیں۔ وہ غراتا ہے اور جھجکتا ہے۔ دیکھیے لیٹا دم ہلا رہا ہے۔ یہ سب کتوں ہی کی سی باتیں ہیں۔

فاؤسٹ: آ! ہمارے ساتھ چل چل!

واگنر: کتا بھی کچھ بے وقوف سا جانور ہے۔ جب تک آپ چپ چاپ کھڑے ہیں وہ منتظر رہتا ہے اور جہاں آپ نے بات شروع کی آپ کی طرف جھپٹتا ہے' اگر کوئی چیز کھو جائے تو اسے ڈھونڈ لائے گا۔ اگر دریا میں چھڑی گر جائے تو وہ بھی فوراً کود پڑے گا۔

فاؤسٹ: تم ٹھیک کہتے ہو' روح وغیرہ کچھ نہیں۔ یہ محض ایک سدھایا ہوا کتا ہے۔

واگنر: کتا اگر اچھی طرح سکھایا جائے تو دانشمندوں تک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے' بیشک یہ آپ کی نظر عنایت کا مستحق ہے اور بہت سے یونیورسٹی کے طالب علموں سے اچھا شاگرد ہے۔

(وہ شہر کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہیں)

مطالعے کا کمرہ

(فاؤسٹ داخل ہوتا ہے کتا بھی ساتھ ہے)

میں کھیتوں اور چراگاہوں سے آیا ہوں جن پر رات کی تاریکی پراسرار اور پاک رعب کے ساتھ چھائی ہوئی ہے اور ہماری روح کی اعلیٰ قوتوں کو ابھارتی ہے۔ اب میرے دل کی وحشت انگیز لہریں تھم گئی ہیں اور طوفان عمل ساکن ہو گیا ہے' اب انسانی محبت اور عشق الٰہی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔

تھم جا اے کتے ادھر ادھر مت دوڑ۔ تو یہاں دہلیز پر کیا سونگھ رہا ہے؟ جا آتشدان کے پیچھے لیٹ جا۔ میرے پاس جو سب سے اچھا گدا ہے وہ میں تجھے دیتا ہوں۔ جس طرح تو وہاں پہاڑی رستے پر اچھل کود کر ہمیں خوش کر رہا تھا۔ اسی طرح اب میں تجھے اپنا بے زبان عزیز مہمان سمجھ کر تیری خاطر کروں گا۔

جب ہمارے چھوٹے سے کمرے میں ہمارا دل سوز چراغ جلتا ہے تو دل کا کنول بھی روشن ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو پہچانتا ہو۔ عقل کی زبان کھلتی ہے اور امید کی کلی کھلتی ہے' انسان

کو زندگی کے چشموں بلکہ زندگی کے سرچشمے کی آرزو بے چین کر دیتی ہے۔

اے کتے تو کیوں غراتا ہے' تیری یہ حیوانی آواز ان مقدس نغموں سے میل نہیں کھاتی جو میری روح میں گونج رہے ہیں۔ انسانوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو نہیں سمجھتے اس پر ہنستے ہیں اور حسن و خیر کے جلوے کی تاب نہیں لا سکتے تو غراتے ہیں۔ کیا کتے کا بھی یہی دستور ہے؟

مگر افسوس! اب میرے سکون قلب کا خاتمہ ہے۔ میں لاکھ چاہتا ہوں مگر میرے سینے سے جمعیت خاطر کا چشمہ نہیں ابلتا۔ آخر یہ دھارا اس قدر جلد کیوں رک گیا اور میری دل کی کھیتی کیوں سوکھ کر رہ گئی؟ یہ واردات مجھ پر اکثر گزرتی ہے مگر اس کا علاج بھی معلوم ہے (ایسی صورت میں) انسان کا دل خود بخود آسمانی چیزوں کی طرف کھنچتا ہے۔ اور کلام الٰہی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ جس کا سب سے برتر اور حسین مظہر انجیل مقدس ہے۔ میرا دل بے اختیار چاہتا ہے کہ انجیل کا اصل متن پڑھ کر معنوی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ اپنی پیاری جرمن زبان میں کروں۔

(وہ ایک کتاب کھول کر رکھتا ہے اور ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے)

لکھا ہے "جب کچھ نہ تھا تو کلمہ تھا۔" ارے یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ کون ہے جو میری مدد کرے؟ بھلا میں لفظ کی اتنی عظمت کیسے تسلیم کرلوں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا ترجمہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ اے نور عرفان میری شمع راہ بن۔ لکھا ہے "جب کچھ نہ تھا تو معنی تھا۔" ٹھہر جا' پہلی سطر پر اچھی طرح غور کرلے' تیرا قلم حد سے زیادہ تیز نہ چلے۔ کیا معنی خالق کل اور قادر مطلق ہے؟ یوں ہونا چاہیے تھا "جب کچھ نہ تھا تو قوت تھی۔" مگر یہ لکھتے لکھتے کوئی میرا ہاتھ پکڑے لیتا ہے۔ الحمدللہ! نور عرفان نے میری مدد کی۔ یکا یک میری نظر سے حجاب اٹھ گیا۔ اب میں دل جمعی سے لکھتا ہوں "جب کچھ نہ تھا تو فعل خلاق تھا۔"

اے کتے اگر تو میرے ساتھ اس کمرے میں رہنا چاہتا ہے تو یہ بھوکنا چلانا بند کر دے۔ مجھے ایسے ساتھی کی برداشت نہیں جو میرے کام میں مخل ہو۔ ہم دونوں میں سے ایک یہاں رہ سکتا ہے۔ اب میں ناچار مہمان نوازی کو خیر باد کہتا ہوں۔ دروازہ کھلا ہے جا اپنی راہ لے مگر ہائیں یہ میں کیا دیکھتا ہوں! ایسا بھی کہیں ہوا ہے؟ یہ نظر کا دھوکا ہے یا حقیقت میں کتا پھولتا چلا جاتا ہے! دیو کا دیو سامنے کھڑا ہے! یہ کتے کی شکل نہیں! میں کس بلا کو اپنے ساتھ لے آیا! یہ تو نیل کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ انگارہ سی آنکھیں' خوفناک دانت! ٹھہر تیرا علاج میرے پاس ہے۔ ان دوغلے جہنم کے

بچوں کے لیے مفتاح سلیمانی سے کام لینا چاہیے۔

(روحیں برآمدے میں چلاتی ہیں)

ہم میں سے ایک اندر قید ہے۔ باہر ہی رہو! اس کے پاس نہ جاؤ۔ پرانا بن بلاؤ ڈر سے بدحواس ہے' جیسے پنجرے کے اندر لومڑی ہو۔ خبردار اندر نہ جانا ادھر ادھر منڈلاؤ' وہ خود ہی چھوٹ جائے گا۔ جہاں تک بن پڑے اسے قید نہ رہنے دو۔ اس نے ہم سب پر بڑے احسان کیے ہیں۔

فاؤسٹ: اس عجیب الخلقت جانور کو رام کرنے کے لیے چاروں روحوں والے منتر کی ضرورت ہے:۔

اے روح آتشی جل جا' اے روح آبی بہہ جا' اے روح ہوائی اڑ جا' اے روح خاکی ہوشیار ہو جا'

جو شخص عناصر کے خواص اور ان کی قوت سے واقف نہیں وہ روحوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔

اے روح آتشی شعلہ بن کر غائب ہو جا'

اے روح آبی سیل خروشاں بن کر بہہ جا'

اے روح ہوائی شہاب ثاقب بن کر چمک'

اے روح خاکی تو گھریلو رفیق ہے' مدد کر، ظاہر ہو جا'

چاروں میں سے کوئی روح اس جانور میں نہیں۔ وہ مزے میں دانت نکالے لیٹا ہے جیسے مجھ پر ہنستا ہو۔ میں اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا مگر ٹھہر تجھے میرا حکم ماننا پڑے گا۔ میں اور قوی منتر سے کام لیتا ہوں۔ دیکھ اے نابکار اے جہنم سے بھاگی روح' اس نقش کو دیکھ جس کے آگے ساری ظلمات کی قوتیں سر جھکاتی ہیں۔ لو اس کے بال کھڑے ہو کر سیہی کے کانٹے بن گئے۔ مردود مخلوق لے اسے پڑھ' اس نارستہ اسم کو' اس ناگفتہ کلمے کو جو زمین سے آسمان تک جاری و ساری ہے اور ہمارے گناہوں سے مجروح۔

اب وہ آتش دان کے پیچھے چھپا ہے اور پھول کر ہاتھی بن رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سارے کمرے میں سما جائے گا۔ چھت کی طرف مت بڑھ۔ آ اپنے مالک کے قدموں پر سر رکھ۔ تو نے دیکھا میری دھمکی بیکار نہ تھی۔ میں تجھے جلتی آگ میں جھلس دوں گا۔ اتنی دیر نہ لگا کہ مجھے قہری آگ بھڑکانا پڑے جو میرے ساحرانہ کمال کا آخری کرشمہ ہے۔

(کہر چھا جاتا ہے' شیطان ایک جہاں گرد مُلّا کے لباس میں آتشدان کے پیچھے سے ظاہر ہوتا ہے)

شیطان: یہ چیخ پکار کیوں؟ فرمائیے کیا حکم ہے۔

فاؤسٹ: خوب! یہ کتے کے خول میں آپ تھے' ایک جہاں گرد مُلّا۔ مجھے اس واقعے پر ہنسی آتی ہے۔

شیطان: میں حضرت علامہ کی خدمت میں آداب بجالاتا ہوں۔ آپ نے مجھے پسینے پسینے کردیا۔

فاؤسٹ: اسم مبارک؟

شیطان: میرے نزدیک یہ سوال اتنے بڑے شخص کے لیے جو الفاظ کو اس قدر حقیر سمجھتا ہے' بہت چھوٹا ہے۔ آپ کی نظر تو ظاہری پردوں کو ہٹا کر حقیقت ذات کو دیکھتی ہے۔

فاؤسٹ: آپ حضرات کی ذات آپ کے نام ہی سے پہچانی جاتی ہے۔ مکھیوں کے دیوتا' رہزن ایمان' جھوٹوں کے بادشاہ' ایسے ناموں سے آپ کی حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ خیر یہ تو بتائیے آپ ہیں کون؟

شیطان: اس قوت کا ایک جز جو ہمیشہ بدی کرنا چاہتی ہے اور ہمیشہ نیکی کرتی ہے۔

فاؤسٹ: اس معمے کا مطلب؟

شیطان: میں وہ روح ہوں جو ہر چیز کا انکار اور ہر چیز کی نفی کرتی ہے اور میں حق بجانب ہوں۔ کیونکہ جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں سب اس قابل ہیں کہ معدوم ہو جائیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ کوئی چیز وجود میں نہ آئے۔ پس وہ جسے آپ گناہ' ہلاکت' بدی کہتے ہیں میری سرشت ہے۔

فاؤسٹ: تو اپنے کو ایک جز کہتا ہے حالانکہ میرے سامنے پورا کا پورا کھڑا ہے۔

شیطان: میں تیرے سامنے عاجزانہ حقیقت بیان کرتا ہوں۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنی ذات کو اس دنیائے حماقت کو' ایک وجودِ کلی سمجھتا ہے۔ میں اس جز کا ایک جز ہوں جو ابتدا میں کُل تھا' اس ظلمت[1] کا ایک ٹکڑا ہوں جس سے نور پیدا ہوا' وہ متکبر نور[2] جو اپنی ماں شب تاریک کا مدمقابل بن کر

---

1. عدم۔
2. روح انسانی۔

اس سے اس کی قدیم عظمت' اس کی مکانی قلمرو چھیننا چاہتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ وہ لاکھ ہاتھ پیر مارے مگر اجسام خاکی کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ جسموں میں چمکتا ہے اور جسموں کو چمکاتا مگر جسم اس کو آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ جسموں کے ساتھ خاک میں مل جائے گا۔

فاؤسٹ: اچھا! اب مجھ پر کھلا کہ تیرا مبارک فرض کیا ہے۔ تو کائنات اکبر کو برباد نہیں کر سکتا' اس لیے کائنات اصغر سے ابتدا کرتا ہے۔

شیطان: اور سچ پوچھئے تو یہاں بھی کچھ کام چلتا نہیں نظر آتا۔ اس عدم کے حریف' اس وجود اس کثیف عالم سے میں کتنا کچھ چھین چکا مگر موجوں سے طوفانوں سے' زلزلوں سے' آگ کے شعلوں سے اس کا کچھ نہیں بگڑا' اب دیکھتا ہوں تو بر و بحر کی وہی شان ہے جو پہلے تھی۔ اور یہ کمبخت مخلوق انسانوں اور جانوروں کے بچے کسی طرح غارت نہیں ہوتے نہ جانے کتنوں کو دفن کر چکا مگر جب دیکھئے ایک نئی نسل موجود ہے' جس کی رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا ہے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلا جا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سر پھوڑ لوں! ہوا سے' پانی سے' مٹی سے' خشکی میں' تری میں' گرمی میں' سردی میں' ہزاروں سنگے پھوٹتے چلے آتے ہیں۔ اگر میں آگ کو اپنے لیے محفوظ نہ کر لیتا تو میرے پلے کچھ نہ رہتا۔

فاؤسٹ: یوں کہہ کر تو ابدی ابر کرم' جان بخش قوت خلاق کے سامنے اپنا شیطانی گھونسا تانے کھڑا رہتا ہے مگر تیرے بنائے کچھ نہیں بنتی۔ جا اب کوئی اور شغل ڈھونڈ' اے بنیاد ازلی کے عجیب الخلقت فرزند۔

شیطان: ہم لوگ سچ مچ اس پر غور کریں گے۔ اچھا اب پھر کبھی باتیں ہوں گی۔ اس وقت اجازت ہو کہ میں رخصت ہوں۔

فاؤسٹ: میں سمجھا نہیں کہ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو تجھ سے ملاقات ہو ہی گئی۔ جب جی چاہے میرے پاس آ۔ یہ کھڑکی ہے' یہ دروازہ ہے اور تو تو دودان سے بھی آ سکتا ہے۔

شیطان: سچ سچ کہہ دوں؟ یہاں سے رفو چکر ہونے میں ایک چھوٹی سی چیز حائل ہے۔ یہ درویئد[1] کا قدم جو تیری دہلیز پر بنا ہے۔

---

1. درویئد (Druid) قدیم برطانیہ کا پجاری' ساحر اور نجومی۔

فاؤسٹ: اس پنج گوشے نے تجھے زچ کر دیا ہے؟ مگر اے دوزخ کی اولاد یہ تو کہہ کر جب تیرا اس حلقے میں گزر نہیں تو تو اندر کیسے آیا؟ اتنا بڑا شاطر کیوں کر چکمہ کھا گیا؟

شیطان: غور سے دیکھ یہ شکل مکمل نہیں ہے باہر کی طرف کا گوشہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا ہے۔

فاؤسٹ: یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے تو اب تو میرا قیدی ہے؟ یہ شکار مفت میں ہاتھ آیا۔

شیطان: کتا بے دیکھے بھالے جست کر کے اندر گیا مگر اب معاملہ دوسرا ہے۔ شیطان اس دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔

فاؤسٹ: پھر تو کھڑکی سے کیوں نہیں نکل جاتا؟

شیطان: شیطانوں اور بھوتوں کا یہ قانون ہے کہ جس راستے سے وہ آتے ہیں اسی راستے سے جائیں۔ آنے میں ہم آزاد ہیں جانے میں پابند۔

فاؤسٹ: اچھا جہنم میں بھی قوانین ہیں۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ غالباً اگر کوئی چاہے تو آپ حضرات سے معاہدہ بھی کر سکتا ہے؟

شیطان: بیشک جو وعدہ کیا جائے گا اس سے تو پورا فائدہ اٹھائے گا۔ اس میں بال برابر فرق نہ ہوگا مگر یہ باتیں رواروی میں طے کرنے کی نہیں ہیں۔ آئندہ ملاقات میں اس پر گفتگو ہوگی۔ اس وقت تو میری عاجزانہ التجا ہے کہ مجھے جانے کی اجازت دے دی جائے۔

فاؤسٹ: ذرا ٹھہر جلدی کیا ہے۔ مجھے ایک عمدہ سی کہانی تو سناتا جا۔

شیطان: اب تو جانے ہی دے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ اس وقت جو جی چاہے مجھ سے پوچھنا۔

فاؤسٹ: میں نے کچھ تیرے لیے جال نہیں بچھایا تو آپ ہی آپ آن پھنسا۔ جو شیطان کو پکڑ پائے اسے اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہیے۔ اس کا دوبارہ قابو میں آنا کھیل نہیں۔

شیطان: اگر تیری یہی مرضی ہے تو میں بھی مصاحبت کے لیے حاضر ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے تفریح طبع کے لیے اپنی شان کے مطابق اپنا کمال دکھانے کی اجازت ہو۔

فاؤسٹ: میں شوق سے اجازت دیتا ہوں مگر کوئی دلچسپ تماشا ہو۔

شیطان: میرے دوست تو گھڑی بھر میں محسوس لذتوں کا اتنا لطف اٹھائے گا جتنا معمولی زندگی میں سال بھر میں بھی نصیب نہ ہوتا۔ سبک پرواز روحیں جو گیت سناتی ہیں اور جو خوشنما

تصویریں دکھاتی ہیں وہ خالی خولی "سیمیا کی سی نمود" نہیں۔ اس کے علاوہ تیرا دماغ خوشبو سے معطر ہو جائے گا اور تیری زبان ذائقہ کی شیرینی سے ہونٹ چاٹنے لگے گی۔ تب تجھے معلوم ہوگا کہ لذت کسے کہتے ہیں۔ چلو اے روحو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تم آ تو گئی ہو بس شروع کر دو۔

روحیں: ہٹ جا اے آسمان کے گنبد زرنگاری
دکھا دے اپنا جلوہ اے نیلگوں چرخ اثیر
بکھر جاؤ اے کالے بادلو
چمک اٹھو اے روشن ستارو' چھوٹے آفتابو
آسمان کے دل بندو' روحانی حسینو۔
خرام ناز کا انداز دکھاتے گزر جاؤ
کشش آرزو سے کھنچے چلے جاؤ
اپنے خوشنما لباس' اپنے لہراتے ہوئے پلکوں کا عکس
بساط زمین کے ہر کنج تنہائی پر ڈالو
جہاں عاشق و معشوق نشہ الفت میں سرشار
عمر بھر کے لیے پیمان وفا باندھ رہے ہیں
جدھر دیکھو خود رو درختوں کے کنج نظر آتے ہیں
انگور سے لدی بیل پانی کے خزانے میں جھکی ہے
جو اس کے لیے قرنبیق کا کام دیتا ہے
وہ چشمے جن میں شراب ناب جوش کھاتی ہوئی
بے داغ لعل و جواہر کی کانوں سے جھرتی ہے
پہاڑوں کو پیچھے چھوڑ کر میدانوں میں بہتے ہیں
اور سمندر کی طرح پھیل کر
سر سبز پہاڑیوں کو حلقے میں لے لیتے ہیں
پرندے بادہ مسرت سے سرشار،
سورج کے رخ اور ان جزیروں کے رخ اڑتے ہیں

جو نیرنگ نظر سے موجوں کے ساتھ بہتے نظر آتے ہیں
سنگت میں گانے والوں کی تانیں
ہمارے کانوں کو مسرور کر رہی ہیں
اور مرغزاروں پر ناچنے والوں کی ٹولیاں
ادھر ادھر پھیلی ہوئی ہماری نظروں کو لبھا رہی ہیں
بعض پہاڑیوں پر چڑھ گئے بعض دریا میں تیر رہے ہیں۔
سب زندگی چاہتے ہیں سب اس دور دراز منزل کی طرف بڑھتے ہیں جہاں سرگرم الفت ستارے جلوہ افروز ہیں۔

شیطان: لو وہ سو گیا! شاباش اے سبک پیکر نازنین لڑکو! تم نے اسے اپنی لوریوں سے سچ مچ سلا دیا۔ تمہاری اس رامشگری سے میں زیر بار احسان ہوں۔ اے فاؤسٹ تو ابھی تک وہ انسان نہیں جو شیطان کو جکڑ کر رکھ سکے۔ اسے خواب میں اصنام خیالی کا نیرنگ دکھاؤ اور اوہام کے سمندر میں غرق کر دو مگر مجھے اس طلسم کو توڑنے کے لیے چوہے کے دانت سے مدد لینا ہے' زیادہ دیر منتر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لو وہ ایک چوہے کے پیر کی سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ فوراً میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔

سن! تجھے چوہوں' چوہیوں' مکھیوں' مینڈکوں' کھٹملوں اور جوؤں کا مالک حکم دیتا ہے کہ آگے بڑھ کر اس دہلیز کے اس حصے کو کتر ڈال جس پر وہ تیل چھڑکتا ہے۔ تو کودتا ہوا آن پہنچا؟ بس اپنے کام میں جٹ جا۔ وہ نوک جس کے سبب سے میں گزر نہیں سکتا سب سے آگے کے کونے پر ہے۔ ایک بار اور منہ مار۔ بس اب کام بن گیا۔ اچھا میاں فاؤسٹ تم مزے میں خواب دیکھے جاؤ' پھر ملاقات ہوگی۔

فاؤسٹ: کیا میں نے پھر دھوکا کھایا؟ وہ سب روحیں غائب ہو گئیں۔ کیا وہ سچ مچ کتا تھا جو غائب ہو گیا اور شیطان کا دیکھنا محض خواب تھا۔

مطالعے کا کمرہ

فاؤسٹ، شیطان

فاؤسٹ: کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے! چلے آؤ! چلے آؤ! کون مجھے دق کرنے کو آ گیا؟

شیطان: میں ہوں۔

فاؤسٹ: چلے آؤ۔

شیطان: تم تیسری بار کہو تو آؤں۔

فاؤسٹ: آؤ بھی کسی طرح۔

شیطان: تیری یہ باتیں مجھے پسند ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم دونوں میں نبھ جائے گی۔ تیرا غم غلط کرنے کے لیے میں رئیس زادہ بن کر آیا ہوں۔ ذرا میرا ٹھاٹھ دیکھ لال قبا میں سنہری کام کی گوٹ ہے اور اس پر بے شکن ریشمی عبا، ٹوپی میں مرغی کے پر کی کلغی ہے اور کمر میں شمشیر آبدار۔ میں تجھے بھی یہ صلاح دیتا ہوں کہ میرا جیسا لباس پہن لے تاکہ تو جی کھول کر زندگی کا لطف اٹھا سکے۔

فاؤسٹ: میں تو سمجھتا ہوں کہ چاہے جو لباس پہنوں مجھے اس محدود ارضی زندگی کی کوفت بدستور محسوس ہوگی۔ نہ میں ایسا جوان ہوں کہ اس تماشے سے خوش ہو جاؤں اور نہ ایسا بوڑھا کہ آرزوؤں کے پنجے سے چھوٹ جاؤں؟ مجھے دنیا کیا دے دے گی؟ ترک خواہشات کر، ترک خواہشات کر، یہ وہ ابدی گیت ہے جو ہر شخص کے کانوں میں گونجا کرتا ہے جسے ہماری زندگی کی ہر ساعت بھرائی ہوئی آواز سے گایا کرتی ہے۔ روز صبح اٹھ کر میرے دل میں ہول بیٹھ جاتا ہے اور جی

چاہتا ہے کہ آنے والے دن پر آنسو بہاؤں جس میں میری کوئی آرزو نام کو بھی پوری نہ ہوگی بلکہ راحت کی جو ذرا سی امید باقی ہے وہ بھی ضد اور اعتراض کی بدولت مٹ جائے گی اور میری قوت تخلیق کی راہ میں زندگی کے ہزاروں بکھیڑے حائل ہو جائیں گے۔ اسی طرح جب میں رات گئے ڈرتے ڈرتے بستر پر لیٹتا ہوں تو چین نہیں آتا اور پریشان خواب ستایا کرتے ہیں۔ خدا کا تصور جو میرے دل میں رہتا ہے، میری باطنی زندگی میں ہیجان برپا کرنے پر قادر ہے اور میری ساری قوتوں کا مبداء اصلی ہے، عالم ظاہری میں بے دست و پا ہے۔ اس لیے مجھے زندگی اجیرن ہے۔ میں موت کا طالب ہوں اور زیست سے بیزار۔

شیطان: پھر بھی موت جب آن پہنچتی ہے تو کوئی دل سے اس کا خیر مقدم نہیں کرتا۔

فاؤسٹ: خوش قسمت ہے وہ شخص جو فاتح کی شان سے عزت کا سہرا سر سے باندھتا ہے اور مستانہ وار رقص سے چور ہو کر کسی حسینہ سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ آہ، کاش میں بھی اسی عالم میں روح برتر کی قوت سے مسحور، بے جان ہو کر گر پڑتا۔

شیطان: مگر پھر بھی کوئی اس رات کو زعفرانی عرق پیتے پیتے رہ گیا۔

فاؤسٹ: معلوم ہوتا ہے تجھے جاسوسی کا بھی شوق ہے۔

شیطان: میں عالم کل تو نہیں مگر پھر بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔

فاؤسٹ: مجھے اس خوفناک کشمکش سے ایک جانے بوجھے راگ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور بچپن کے جو جذبات دل میں باقی تھے انہیں گزرے ہوئے زمانے کی یاد دلا کر دام فریب میں گرفتار کر لیا، اب میں ان نغموں کو کوستا ہوں جنہوں نے میری روح پر دلربا شعبدوں کا جال ڈال کر ایسا سبز باغ دکھایا کہ وہ اب تک اس سیہ خانے میں گرفتار ہے۔ لعنت ہو ان بلند خیالات پر جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، لعنت ہو مظاہر کی نظر بندی پر جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے۔ لعنت ہو شہرت اور بقائے دوام کے فریب پر جو ہمیں خواب میں آ کر پھسلاتا ہے، لعنت ہو بیوی بچے کھیت کھلیان پر جو ہمیں خوشامد کی لوری دیتے ہیں۔ لعنت ہو مال و حشم پر جو ہمیں منچلے

پن کے کاموں پر ابھارتا ہے یا عیش و عشرت میں مدہوش کر دیتا ہے۔ لعنت ہو انگور کے آب حیات پر، لعنت ہو محبت کے راز و نیاز پر، لعنت ہو امید پر، لعنت ہو عقیدے پر اور سب سے بڑھ کر لعنت ہو صبر پر[1]

روحوں کا کورس

(نظر سے پوشیدہ)

"افسوس! صد افسوس
تو نے مسمار کر دیا
خوبصورت دنیا کو
اپنے زبردست گھونسے سے
وہ بیٹھ گئی ریزہ ریزہ ہو گئی
ایک دیوتا نے اسے پاش پاش کر دیا
ہم اس کے ٹکڑوں کو
عدم کی طرف لیے جا رہے ہیں
اور اس برباد حسینہ پر
نوحہ کر رہے ہیں
اے زمین کے سورما بیٹے
اسے نئی شان سے تعمیر کر
اپنے سینہ میں اپنے دل میں
اس کی پھر سے بنیاد رکھ
زندگی کا ایک نیا دور

---

1. غالبؔ کے مشہور قطعے سے مقابلہ کیجیے:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں"

شیطان: یہ میری ماتحت روحوں میں سے چھوٹی چھوٹی روحیں ہیں۔ سن' یہ کیسے مزے میں بوڑھوں کی طرح سنجیدگی سے لذت و عمل کی صلاح دے رہی ہیں۔ یہ تجھے کنج تنہائی سے' جہاں حواس پر اور حیات کی قوتوں پر جمود چھا گیا ہے نکالنا چاہتی ہیں۔ اپنے غم سے کھیلنا چھوڑ دے جو گدھ کی طرح تیری زندگی کو نوچ کھاتا ہے۔ بری سے بری صحبت میں بھی تجھے اس کا تو احساس ہوگا کہ تو انسان ہے اور انسانوں کے ساتھ ہے مگر اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں تجھے ادنا درجے کے لوگوں میں دھکیل دوں گا۔ میں کوئی برا آدمی نہیں تاہم اگر تو میرے ساتھ مل کر زندگانی کا سفر کرنا چاہے تو میں بے تامل تیری خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے چاہے اپنا رفیق سمجھ چاہے اپنا خادم اپنا غلام۔

فاؤسٹ: اور اس کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہتا ہے۔

شیطان: میں اس دنیا میں تیری خدمت کا بیڑا اٹھاتا ہوں' تیری پلکوں کے اشارے پر کام کروں گا اور دن رات چین نہ لوں گا۔ ہاں اگر اس دنیا میں ہم دونوں ملیں تو تجھے بھی میرے ساتھ یہی کرنا پڑے گا۔

فاؤسٹ: اس دنیا کی مجھے ایسی فکر نہیں۔ پہلے یہ دنیا مسمار ہو جائے پھر دوسری کی فکر ہوتی رہے گی۔ یہی دنیا میری راحتوں کا سرچشمہ ہے۔ یہی سورج میرے آلام کا شاہد ہے' پہلے میں ان دونوں سے نجات پا جاؤں پھر چاہے جو کچھ بھی ہو مجھے اس سے مطلب نہیں کہ آئندہ زندگی میں بھی نفرت اور محبت کا وجود ہوگا یا نہیں ہوگا اور عالم بالا میں بھی پست و بلند کا امتیاز رہے گا یا نہ رہے گا۔

شیطان: اس شرط پر تم یہ سفر اختیار کر سکتے ہو بس عہد کر لو پھر دیکھنا میں تمہیں اپنی کاریگری کے ایسے ایسے کرشمے دکھاؤں گا جو کسی انسان نے نہیں دیکھے۔

فاؤسٹ: ارے تو غریب شیطان مجھے کیا دکھائے گا؟ بھلا تیرا جیسا مخلوق کبھی روح انسانی کی سعی بلند کو سمجھ سکا ہے۔ خیر' یہ بتا تیرے پاس وہ کھانے ہیں جن سے سیری نہیں ہوتی؟ وہ زر سرخ

ہے جو ہاتھ میں لیتے ہی پارے کی طرح اڑ جاتا ہے؟ وہ جوا ہے جس میں انسان کبھی نہیں جیتتا؟ وہ حسین لڑکیاں ہیں جو ایک کے آغوش میں بیٹھ کر دوسرے سے آنکھ لڑاتی ہیں؟ وہ دیوتاؤں کا خوشنما عطیہ عزت ہے جو شہاب ثاقب کی طرح دم بھر چمک کر غائب ہو جاتی ہے؟ مجھے وہ میوے دکھا جو توڑنے سے پہلے سڑ جاتے ہیں اور وہ درخت جو روز مرجھاتے ہیں اور روز ہرے ہوتے ہیں۔

شیطان: ایسی فرمائشوں سے میں نہیں ڈرتا۔ میں یہ سب نعمتیں مہیا کر سکتا ہوں مگر ٹھہرو دوست وہ دن بھی دور نہیں جب تمہاری یہ بے چینی کافور ہو جائے گی اور ہم تم آرام سے بیٹھ کر مزیدار کھانے کھائیں گے۔

فاؤسٹ: اگر میں کبھی چین سے بستر کاہلی پر لیٹوں تو میں اپنی جان ہارا۔ اگر تو کبھی بہلا پھسلا کر مجھے میری زندگی سے مطمئن کر دے اور عیش وعشرت سے دھوکا دے دے تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو۔ میں یہ شرط لگاتا ہوں۔

شیطان: یہ ہے میرا ہاتھ! میں ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوں:

فاؤسٹ: اگر میں کسی لمحے کو مخاطب کر کے کہوں: ''ذرا ٹھہر تو کتنا حسین ہے'' تب تجھے اختیار ہے کہ مجھے طوق وسلاسل میں جکڑ کر قعر مذلت میں دھکیل دے۔ تب فوراً میری موت کا گھنٹہ بجے' تب تو اپنی قید سے آزاد ہے' تب گھڑی رک جائے' سوئی گر جائے' تب میرے لیے وقت کا خاتمہ ہے۔

شیطان: اچھی طرح سوچ سمجھ لے یہ بات مجھے یاد رہے گی۔

فاؤسٹ: تجھے اس کا پورا حق ہے' میرا معاہدہ بے سروپا نہیں۔ اگر میں دم بھر ٹھہر جاؤں تو میں غلام ہوں چاہے تیرا یا کسی اور کا' یہ میرے نزدیک یکساں ہے۔

شیطان: بہت خوب میں اسی وقت سے حضرت علامہ کے خدمتگار کے فرائض انجام دوں گا۔ البتہ ایک گزارش ہے کہ موت زندگی کے خیال سے اگر چند سطریں لکھ دی جائیں تو مناسب ہے۔

فاؤسٹ: اچھا تجھے تحریر بھی چاہیے؟ بڑا ضابطہ بگھارنے والا ہے! تجھے کبھی کسی مرد سے سابقہ نہیں پڑا' تو مردوں کے وعدے کی قدر نہیں جانتا؟ تیرے لیے یہ کافی نہیں کہ میرا قول میری جان کے ساتھ ہے؟ تو سمجھتا ہے اس دنیا میں جس کا دھارا ہمیشہ دریا مواج کی طرح بہتا رہتا ہے۔

زبانی وعدہ مجھے پابند نہیں کر سکتا؟ سچ ہے اس وہم میں ہم سب مبتلا ہیں، کسی کا دل اس سے خالی نہیں۔ مبارک ہے وہ شخص جس کی نیت خالص ہے۔ وہ کسی قربانی سے نہیں ڈرتا پھر بھی تحریری خریطے سے جس پر باضابطہ مہر ہو وہ شخص اس طرح لرزتا ہے جیسے بھوت سے۔ لفظ قلم کے آغوش میں جان دے دیتا ہے۔ بس چمڑے کی جھلی اور موم رہ جاتا ہے۔ آخر اے خبیث تو مجھ سے چاہتا کیا ہے؟ تانبے پر لکھوائے گا یا سنگ مرمر پر، جھلی پر یا کاغذ پر؟ چھینی سے یا سنگتراشی کے آلے سے یا قلم سے؟ تو جو چاہے کہہ دے میں تجھی پر چھوڑتا ہوں۔

شیطان: آخر اس گرمی تقریر کی کیا ضرورت ہے؟ چاہے جس چیز کا ورق ہو کافی ہے۔ بس اس پر ذرا خون سے دستخط کر دینا ہے۔

فاؤسٹ: اگر اس سے تیرا ہر طرح اطمینان ہو جائے گا تو میں بھی اس لغویت پر راضی ہوں۔

شیطان: خون سب سے نرالا عرق ہے۔

فاؤسٹ: اس کا ذرا اندیشہ نہ کر کہ میں معاہدہ توڑ دوں گا جس بات کا میں وعدہ کر رہا ہوں اس کی میں خود ہی دل و جان سے سعی کرتا رہتا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو اتنا ابھار لیا ہے کہ اب میں فقط تیرا ہمسر ہوں۔ روح اکبر نے مجھے رد کر دیا۔ فطرت مجھ سے کھلتی نہیں۔ خیال کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ علم سے میں بیزار ہو گیا ہوں۔ آ اب ہم اپنے اضطراب قلب کو محسوس لذتوں کی چھینٹوں سے تسکین دیں۔ جادو کے پراسرار پردوں میں جتنے کھیل ہیں سب کو تیار رکھ۔ چل ہم ہرچہ بادا باد کہہ کر اپنی کشتی زمانے کے طوفان میں، حوادث کے گرداب میں ڈال دیں پھر رنج و راحت کامیابی اور ناکامی چاہیے جس طرح باری باری سے منہ دکھائیں۔ انسان جب کام کرتا ہے بے چینی سے کرتا ہے۔

شیطان: تمہارے لیے نہ کسی معیار کی پابندی ہے نہ کسی مقصد کی۔ تتلی کی طرح کلی کلی پھرو اور شہد کی مکھی کی طرح اڑتے اڑتے پھولوں کا رس چوسو۔ جو چیز تمہیں بھائے وہی تمہارے لیے اچھی ہے۔ شوق سے ہاتھ بڑھاؤ ذرا نہ شرماؤ۔

فاؤسٹ: میں نے تجھ سے کہہ دیا کہ راحت و مسرت کا سوال نہیں میں تو رندی کا پرستار بننا چاہتا ہوں۔ پر درد لذتوں کا، محبت بھری نفرت کا، تازگی بخش کلفت کا، میرا دل جو طلب علم کی خلش

جو چیزوں کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں جو
سے نجات پا چکا ہے اب کسی درد کو رد نہ کرے گا۔ میں ان سب چیزوں کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں جو
میرے ابنائے جنس کے حصے میں آئی ہیں۔ میں زندگی کے بلند سے بلند اور پست سے پست
جلوے کا مشاہدہ کرنا اور نوع انسانی کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں تا کہ میرا نفس
وسعت پا کر اس کا نفس بن جائے اور آخر ایک دن اس کے ساتھ فنا ہو جائے۔

شیطان: یقین جان میں ہزار ہا سال سے زندگی کی سوکھی روٹی چبا رہا ہوں۔ تجھ سے کہتا
ہوں کہ آج تک کوئی شخص مہد سے لحد تک اس خمیر کو ہضم نہیں کر سکا۔ مجھ جیسے شخص کی بات مان۔ یہ
سارا طلسم صرف خدا کے لیے بنا ہے۔ وہ نور ازلی کے ہالے میں جلوہ افروز ہے اور ہمیں اس نے
ظلمت میں رکھا ہے۔ ہمارے تمہارے لیے دن رات ایک ہے۔

فاؤسٹ: مگر میں تو یہی چاہتا ہوں۔

شیطان: اچھا یوں ہی سہی مگر مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کام بہت ہے اور عمر کم۔ میرا خیال
تھا کہ آپ سمجھانے سے مان جائیں گے۔ اب کسی شاعر کے پاس جائیے اور اس سے کہیے کہ اپنی
وسعت تخیل سے ساری اچھی صفات آپ کی ذات بابرکات میں جمع کر دے۔ شیر کی شجاعت، بارہ
سنگے کی تیزی، اطالیوں کا جوش، شمالیوں کا استقلال، اس سے یہ راز بھی پوچھیے کہ عالی ہمتی اور
چالاکی کو کیسے سمونا چاہیے اور باوجود جوانی کے منچلے پن کے بوڑھوں کی طرح ضبط عشق کیوں کر کرنا
چاہیے۔ مجھے خود ایسے شخص سے ملنے کا شوق ہے جس میں یہ سب باتیں جمع ہوں۔ میں اس کا نام
حضرت کائنات اصغر رکھوں گا۔

فاؤسٹ: اگر میرے لیے انسانیت کا تاج جس کی مجھے دل و جان سے آرزو ہے، سر پر رکھنا
ناممکن ہے تو پھر میں کیا ہوں۔

شیطان: سچ تو یہ ہے تو وہی ہے جو تو ہے۔ چاہے تو کتنی ہی بڑی کلاہ سر پر رکھ لے اور کتنے ہی
بڑے موزے پیر میں پہن لے تو ہمیشہ وہی رہے گا جو تو ہے۔

فاؤسٹ: سچ ہے، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ذہن انسانی کے سارے خزانوں پر قبضہ کرنے
سے مجھے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ جب میں کشمکش حیات سے تھک کر بیٹھتا ہوں تو میرے دل کے اندر
سے کسی نئی قوت کا چشمہ نہیں ابلتا۔ میں بلندی میں بال بھر نہیں بڑھا، حقیقت نامحدود سے اتنا ہی
دور ہوں جتنا پہلے تھا۔

شیطان: حضرت آپ ان چیزوں کو اسی پہلو سے دیکھتے ہیں جس پہلو سے انسان انہیں دیکھا کرتا ہے۔ اب آیئے ان پر دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں۔ قبل اس کے کہ ہمارا عیش زندگی رخصت ہو جائے۔ آخر ہم اپنے ہاتھ، پیر سر وغیرہ کے مالک ہیں۔ ہیں یا نہیں؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں نت نئی لذتیں حاصل کرنے کا حق نہ ہو؟ اگر میں چھ گھوڑوں کی قیمت دے سکتا ہوں تو کیا ان کی قوت میری نہیں؟ مجھے پورا اختیار ہے کہ انہیں گاڑی میں جوت کر دوڑتا پھروں، گویا میرے چوبیس پیر ہیں۔ پس اے بھائی ہمت سے کام لے اس ادھیڑبن کو چھوڑ اور میرے ساتھ چل کر دنیا کے دھارے میں کود پڑ جو شخص ہمیشہ سوچ بچار میں رہتا ہے وہ ایک جانور کی طرح ہے جسے کوئی خبیث روح ایک خشک بیڑ میں چکر دیتی ہے حالانکہ اس کے آس پاس سرسبز مرغزار ہے۔

فاؤسٹ: آخر ہم ابتدا کیسے کریں؟

شیطان: بس فوراً چل کھڑے ہوں۔ یہ تو کس عذاب میں گرفتار ہے! یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ مکتب میں بیٹھے اپنا اور لونڈوں کا مغز خالی کر رہے ہیں؟ یہ کام اپنے ہمسائے ''وانسٹ'' کے لیے چھوڑ دے۔ بھلا سوکھی گھاس کو کوٹنے پیٹنے سے کیا فائدہ؟ اگر تو کوئی کام کی بات جانتا بھی ہے تو وہ لڑکوں سے کہنے کی نہیں۔ ہائیں یہ آواز کیسی؟ معلوم ہوتا ہے برآمدے میں کوئی لڑکا آ رہا ہے۔

فاؤسٹ: میں اس وقت اس سے نہیں مل سکتا۔

شیطان: بیچارہ بڑی دیر سے انتظار کر رہا ہے، اس کا دل نہ توڑنا چاہیے۔ لا مجھے اپنا چوغہ اور کلاہ دے دے۔ مجھ پر یہ بہروپ خوب کھلے گا۔

بس اب تو یہ معاملہ میری تیزی طبع پر چھوڑ دے۔ مجھے پاؤ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ جب تک تو سفر کے لیے تیار ہو جا۔

(فاؤسٹ چلا جاتا ہے)

شیطان: (فاؤسٹ کا لمبا چوغہ پہنے ہوئے)

اچھا ہے تو عقل اور علم کو انسان کی بلند ترین قوت کو حقیر سمجھے جا، جھوٹ کی روح کے بہکانے سے جادو اور نیرنجات کے عقیدے میں اور پختہ ہوتا جاتا، اس طرح تو یقیناً میرے قابو میں آ جائے گا۔ اسے تقدیر نے ایسی طبیعت دی ہے جو ساری قیدوں کو توڑ کر آگے بڑھنے پر مجبور ہے اور وہ سعی بے قرار جس نے دنیاوی راحتوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، میں اسے سراب زندگی کی سیر کراؤں گا۔ سطحی

بے معنی تماشے دکھاؤں گا۔ وہ کبھی بے چینی سے تڑپے گا، کبھی سکتے میں رہ جائے گا مگر مجھ سے چمٹا رہے گا۔ اس کے ہَوَکے کو بڑھانے کے لیے میں اس کے ہونٹوں کے پاس کھانا پانی لا کر ہٹا لیا کروں گا۔ وہ غذا کے لیے ناک رگڑے گا مگر ایک دانہ نہ پائے گا۔ سچ پوچھو تو اگر وہ شیطان کے ہاتھ نہ بھی بکتا تب بھی اس کی تباہی یقینی تھی۔

(ایک طالب علم داخل ہوتا ہے)

طالب علم: میں اس شہر میں حال ہی میں آیا ہوں اور دل میں جوش عقیدت لیے ہوئے اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں جس کا نام ہر شخص ادب سے لیتا ہے۔

شیطان: تمہاری سعادت مندی سے مجھے بہت خوشی ہوئی مگر بھائی میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ میرے جیسے بہت سے پڑے ہیں۔ تم اور حضرات کے پاس بھی گئے تھے؟

طالب علم: میری التجا ہے کہ آپ ہی میری سرپرستی قبول فرمائیں۔ میرے دل میں ہمت ہے، جیب میں تھوڑا بہت روپیہ ہے اور رگوں میں تازہ خون ہے۔ میری ماں پر میری جدائی شاق تھی مگر میرے دل سے لگی تھی کہ یہاں آ کر کچھ پڑھ لکھ جاؤں۔

شیطان: شاباش! تم اچھے ٹھکانے آئے۔

طالب علم: سچ پوچھیے تو میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی لوٹ جاؤں۔ ان اونچی اونچی دیواروں میں، ان اندھیرے کمروں میں، میرا جی کسی طرح نہیں لگتا۔ ہر طرف سے بند جگہ ہے نہ کہیں سبزہ نظر آتا ہے نہ درخت۔ لکچر کے ہالوں میں بنچوں پر بیٹھ کر میں دیکھنے، سننے، سوچنے سے معذور ہو جاتا ہوں۔

شیطان: یہ تو عادت کی بات ہے بچہ ابتدا میں ماں کا دودھ پینے سے گھبراتا ہے مگر بہت جلد غٹ غٹ پینے لگتا ہے۔ اسی طرح تمہیں بھی علم و حکمت کا تھن چوسنے میں روز بروز زیادہ لطف آئے گا۔

طالب علم: میں آپ کی خدمت میں خوشی سے رہوں گا۔ مگر یہ تو فرمائیے، داخلے کی کیا کیا شرائط ہیں۔

شیطان: پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون سا شعبہ انتخاب کرتے ہو؟

طالب علم: میں یہ چاہتا ہوں کہ عالم فاضل بنوں، زمین اور آسمان کی ساری چیزوں سے علوم

دفنون اور فطرت سے واقف ہو جاؤں۔

شیطان: ٹھیک ہے' یہی سیدھا راستہ ہے مگر خبردار وقت ضائع نہ کرنا۔

طالب علم: میں دل و جان سے محنت کروں گا' لیکن جی چاہتا ہے کہ بہار کی چھٹیوں میں مجھے ذرا سی آزادی ملے اور تفریح کی اجازت ہو۔

شیطان: وقت سے کام لو یہ گزرنے والی چیز ہے۔ ضبط و ترتیب سے وقت میں گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے عزیز من میری رائے ہے کہ سب سے پہلے تم منطق کے درس میں شریک ہو۔ اس سے تمہارے دماغ کی تربیت ہوگی۔ گویا وہ بیل کی طرح جوت دیا جائے گا کہ خیال کی سیدھی سڑک پر جگالی کرتا چلا جائے اور ادھر ادھر بھٹکتا نہ پھرے۔ وہاں تمہیں یہ تعلیم دی جائے گی کہ کھانے پینے اور دوسرے کاموں میں جو تم روزمرہ بے تکلف کرتے تھے تفکر اور تعمق کی ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ دماغ کے کارخانے کا بھی وہی حال ہے جو جلاہے کی کرگھا کا ہے۔ ایک چکر میں سارا تانا بانا الجھتا سلجھتا ہے' نال ادھر سے ادھر پھرتی ہے' سوت بن دیکھے لپٹتا کھلتا ہے' ذرا سے جھٹکے میں خدا جانے کتنے تار ٹوٹ جاتے ہیں' اسی طرح منطقی ادھیڑ بن کرتا ہے اور اپنے استدلال سے مسئلے کو ثابت کر دیتا ہے۔ پہلا قضیہ یوں ہے' دوسرا یوں ہے' اس لیے تیسرا اور چوتھا یوں ہے۔ اگر پہلا اور دوسرا نہ ہوتا تو تیسرا اور چوتھا کبھی نہ ہوتا۔ اس پر سارے شاگرد سر دھنتے ہیں لیکن کپڑا بننا کسی کو نہیں آتا۔ جو شخص کسی زندہ چیز کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے وہ پہلے اس کی روح کو نکال پھینکتا ہے' اس کے بعد اجزا کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے مگر افسوس ان میں سب ملتا ہے۔ فقط روحانی رشتہ نہیں ملتا۔ علم کیمیا اسے عمل تحلیل کہتا ہے مگر اصل میں وہ اپنا مذاق آپ اڑاتا ہے۔ اسے سر پیر کی خبر نہیں۔

طالب علم: میں آپ کی تقریر اچھی طرح سمجھا نہیں۔

شیطان: کوئی حرج نہیں' آگے چل کر جب تم تحویل و تقسیم و ترتیب سے واقف ہو جاؤ گے تو کوئی دقت نہ ہوگی۔

طالب علم: مجھے تو چکر آ گیا۔ سر میں چکیاں سی چل رہی ہیں۔

شیطان: اس کے بعد تمہیں سب سے پہلے مابعدالطبیعیات کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ بس یہ کوشش کرو کہ جو چیزیں انسان کے ذہن میں نہیں سما سکتیں ان کا وقت نظر سے مطالعہ کر ڈالو۔ ہر چیز

کے لیے چاہیے سمجھ میں آئے یا نہ آئے' کوئی شاندار لفظ گھڑ لو۔ مگر ابھی چھ مہینے تک منطقی منہاج سیکھتے رہو۔ روزانہ پانچ گھنٹے لیکچر سننا پڑے گا' بس گھنٹہ بجتے ہی پہنچ جایا کرو۔ گھر سے اچھی طرح مطالعہ کر کے اور مضمون کو صفحہ وار ذہن نشین کر کے آؤ تاکہ تمہیں آسانی سے معلوم ہو جائے کہ استاد لفظ بلفظ وہی کہتا ہے جو کتاب میں لکھا ہے مگر یاد رکھو اس کا لیکچر حرف بحرف نقل کیا کرو۔ گویا روح اقدس بول رہا ہے اور تم لکھ رہے ہو۔

طالب علم: اس بارے میں آپ کی تاکید کی ضرورت نہیں میں خود جانتا ہوں کہ اس سے کتنا فائدہ ہوتا ہے کیونکہ انسان جس چیز کو کاپی پر لکھ لیتا ہے اسے اطمینان سے گھر لے جا سکتا ہے۔

شیطان: مگر شعبے تو انتخاب کر لو۔

طالب علم: قانون سے مجھے دلچسپی نہیں۔

شیطان: اس میں مجھے تم پر کوئی اعتراض نہیں' مجھے معلوم ہے کہ اس علم کا کیا حال ہے۔ قوانین بھی دائمی بیماری کی طرح موروثی ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں' ایک نسل سے دوسری نسل میں پہنچتے ہیں۔ معقول بات مہمل ہو جاتی ہے' مفید چیز مصیبت بن جاتی ہے' وائے ہو اس پوتے پر جسے دادا کا ورثہ ملے۔ اس قانون کی جو ہماری فطرت میں ہے' افسوس کسی کو فکر نہیں۔

طالب علم: آپ نے میری نفرت کو اور بڑھا دیا۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو آپ سے استفادہ کرے۔ میرا کچھ کچھ ارادہ ہوتا ہے کہ دینیات پڑھوں۔

شیطان: میں تمہیں گمراہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس علم میں لغزش کا بڑا اندیشہ ہے۔ اس کے اندر زہر اور تریاق ملا ہوا ہے اور دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔ یہاں بھی بہترین تدبیر یہی ہے کہ تم صرف ایک استاد سے درس لو اور جو کچھ وہ کہے آنکھ بند کر کے مان لو۔ بس الفاظ کو پکڑے رہو۔ انہیں سے سروکار رکھو۔ اس طرح تم بے بھٹکے ہوئے منزل یقین پر پہنچ جاؤ گے۔

طالب علم: مگر الفاظ کے معنی بھی تو ہوتے ہیں۔

شیطان: بیشک ہوتے ہیں مگر انہیں زیادہ چھیڑنا نہیں چاہیے۔ جہاں معنی کی جگہ خالی ہوتی ہے وہاں چپکے سے کوئی لفظ آن بیٹھتا ہے۔ الفاظ سے معرکے کے مناظرے ہو سکتے ہیں' الفاظ سے پورا نظام بن سکتا ہے۔ الفاظ پر ایمان لانا بھی سہل ہے۔ معنی میں خلل پیدا ہو سکتا ہے مگر لفظ خلل سے پاک ہے۔

طالب علم: معاف کیجئے گا میں سوال پر سوال کر کے آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ بس تھوڑی سی تکلیف اور دینا چاہتا ہوں۔ ذرا آپ طب کے متعلق بھی دو چار جملے فرما دیتے۔ تین سال کا قلیل زمانہ دیکھئے اور علم کا میدان دیکھئے جس کا کہیں اور ہے نہ چھور۔ کوئی ذرا سا اشارہ کرنے والا ہو پھر انسان خود راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔

شیطان: (اپنے آپ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے) میں اس خشک انداز گفتگو سے گھبرا گیا' اب ذرا شیطان پن کرنا چاہیے۔

(بلند آواز سے) طب کی حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ بس تم کائنات کا اور جسم انسان کا مطالعہ کر ڈالو اور دونوں کو خدا کی مرضی پر چلنے دو۔ تحصیل علم میں ہر طرف ہاتھ پیر مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہر شخص اتنا ہی سیکھتا ہے جتنا وہ سیکھتا ہے۔ البتہ کام کا آدمی وہ ہے جو موقع پر کام چلا لے۔ تم اچھے خاصے وجیہ آدمی ہو' منچلا پن بھی تم میں آ ہی جائے گا' جب تم اپنے آپ پر بھروسہ کرو گے تو دوسرے بھی تم پر بھروسہ کرنے لگیں گے۔ خصوصاً عورتوں کو پھانسنے کا طریقہ ضرور سیکھو۔ ان کی ساری ہائے وائے کا بس ایک ہی علاج ہے اور اگر تم بظاہر پارسا بنے رہو گے تو وہ آسانی سے قابو میں آ جائیں گی۔ ایک تو تمہارے پاس کوئی شاندار سند ہو تا کہ وہ تمہاری حذاقت کی قائل ہو جائیں' دوسرے جب وہ آئیں تو خیر مقدم کے طور پر اختلاط کرو جس کی تمنا میں لوگ برسوں تڑپتے ہیں۔ نبض دیکھتے وقت ہاتھ زور سے دباؤ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اظہار شوق کرتے ہوئے ذرا کمر میں بھی ہاتھ ڈال کر دیکھو کہ کہیں محرم کی ڈوریاں کس کر تو نہیں بندھی ہیں۔

طالب علم: ہاں یہ دلچسپ بحث ہے' اس کا آگاہ پیچھا سمجھ میں آتا ہے۔

شیطان: میرے دوست نظری علوم خشک اور بے رنگ ہیں اور عملی زندگی ہرا بھرا درخت۔

طالب علم: میں قسمیہ کہتا ہوں کہ آپ کی باتیں مجھے خواب سی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پھر حاضر ہو کر آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہوں۔

شیطان: مجھے جو کچھ آتا ہے خوشی سے بتانے کو تیار ہوں۔

طالب علم: یہاں سے جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ لیجئے یہ میری خاندانی بیاض ہے۔ مہربانی فرما کر اس میں اپنے دست مبارک سے کچھ تحریر کر دیجئے۔

شیطان: بڑی خوشی سے

(وہ کچھ لکھ کر بیاض واپس کر دیتا ہے۔

طالب علم: (پڑھتا ہے) تم دیوتاؤں کی طرح نیکی اور بدی دونوں کا علم حاصل کرو۔

(کتاب کو ادب سے بند کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے)

شیطان: بس اس مقولہ پر عمل کر اور میری خالہ ناگن کی تقلید کیے جا۔ ایک دن تیرے شبیہ ایزدی ہونے کی حقیقت کھل جائے گی۔

(فاؤسٹ داخل ہوتا ہے)

فاؤسٹ: کہاں چلنا ہے؟

شیطان: جہاں تیرا جی چاہیے۔ پہلے ہم کائنات اصغر (انسان) کا مطالعہ کریں گے پھر کائنات اکبر کا۔ تجھے اس نصاب کے پورا کرنے سے بڑی خوشی ہوگی اور بڑا فائدہ ہوگا۔

فاؤسٹ: مگر اس لمبی ڈاڑھی کے سبب سے مجھ میں زندہ دلی نہیں رہی۔ یہ کوشش فضول ہے۔ میں علم مجلس میں بالکل کورا ہوں، دوسروں کے سامنے میں اپنی نظروں میں، میں آپ گر جاتا ہوں۔ میں ہر صحبت میں جھینپ جایا کروں گا۔

شیطان: میرے پیارے دوست سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا جہاں تو نے مجھ پر بھروسہ کیا بس تجھے زندگی کا گر آ گیا۔

فاؤسٹ: ہم یہاں سے چلیں گے کیسے؟ نہ گاڑی ہے نہ گھوڑا نہ سائیس۔

شیطان: یہ چوغا جو تو دیکھتا ہے ہمیں دوش ہوا پر لے جائے گا مگر اب جرأت آزما سفر میں کچھ سامان ساتھ نہ لے۔ میں آگ سے تھوڑا سا بخار پیدا کرتا ہوں جو ہمیں بات کی بات میں زمین سے اٹھا کر لے جائے گا اور ہم جتنے ہلکے ہوں گے اتنی ہی تیزی سے اڑیں گے۔ میں تجھے اس نئی زندگی کی مبارکباد دیتا ہوں۔

شہر لائپزش آؤایرباخ کا تہ خانہ

یاروں کی صحبت مے نوشی

فروش: کیا بات ہے نہ کوئی پیتا ہے، نہ ہنستا بولتا ہے؟ اور کچھ نہیں تو ذرا منہ ہی چڑاؤ، روز تو تم بکر کود مچائے رہتے تھے آج کیوں بھیگی بلی بنے بیٹھے ہو۔

برانڈر: یہ سب تیرا قصور ہے۔ تو آج نہ کوئی حماقت کرتا ہے نہ سور پن۔

(فروش اس کے سر پر شراب کا گلاس انڈیل دیتا ہے)

برانڈر: یہ کیا حرکت ہے، سور کہیں کا!

فروش: لو تمہیں نے تو سور پن کی فرمائش کی تھی۔ زیبل: خبردار! اگر جھگڑا کیا تو دروازے کے باہر دھکیل دوں گا۔ خوب دل کھول کر پیو اور سب مل کر گاؤ۔ لالالالالالالا!

آلٹ مائز: ارے غضب! ذرا سی روئی دینا یہ تو کان پھاڑے ڈالتا ہے۔

زیبل: واہ، جب تک چھت سر پر نہ اٹھالو پنچم کا زور نہیں بندھتا۔

فروش: ٹھیک ہے، جو کوئی برا مانے اسے نکال دو' آ' تارالاراڈا!

آلٹ مائز: آ! تارالارالا!

فروش: اب سر ٹھیک ہوا۔

(گاتا ہے)

یہ پیارا پاک رومی راج

اب تک کیسے قائم ہے؟

برانڈر: لاحول ولاقوہ! یہ سیاسی گیت، یہ مہمل گیت۔ روز صبح اٹھ کر خدا کا شکر کیا کرو کہ رومی راج کی فکر تمہارے سر نہیں۔ بھائی میں تو اسے بڑی نعمت سمجھتا ہوں کہ نہ میں قیصر ہوں نہ وزیراعظم۔ مگر ہمارا کوئی سردار بھی ضرور ہونا چاہیے۔ آؤ اپنے میں سے ایک پوپ چنیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کے لیے کون سی صفت ضروری ہے؟

فروش: (گاتا ہے)

اٹھ ری بلبل اڑ کر جا

پیا کو میرا سندیس پہنچا

زیبل: یہ پیا کا سندیس وندیس رہنے دو مجھے یہ پسند نہیں۔

فروش: پیا کو سندیس اور پیار۔ تیرے باپ کا اجارہ ہے۔

(گاتا ہے)

کھول کواڑ، رات اندھیری

کھول کواڑ پیا ٹھاری
موند کواڑ اب تڑکا ہووے

زیبل: گائے جا' گائے جا' پیا کو سراہے جا وہ وقت بھی آئے گا جب میں تجھ پر خوب ہنسوں گا مجھے تو وہ جل دے ہی چکی ہے' تیرے ساتھ بھی یہی کرے گی۔اس کا یار کوئی بھوت ہو تو اچھا ہے وہی اسے ٹھیک کر سکتا ہے۔اللہ کرے کوئی بڈھا بکرا ہلاک برگ سے لوٹتے ہوئے اس سے بھینٹ کرے۔کوئی جیتا جاگتا بھلا آدمی اس قحبہ کے لائق نہیں۔اسے پیام کیا بھیجتا ہے۔میری طرف سے اس کی کھڑکی کے شیشے توڑ ڈال۔

برانڈر: (میز پر ہاتھ مار کر)

ادھر دیکھو! میری بات سنو! تمہیں ماننا پڑے گا کہ میں تم سب سے سیانا ہوں۔دیکھو یہاں دل پھینک لگ جمع ہیں۔ان کی شان کے لائق کوئی چیز گانا چاہیے۔سنو! میں بالکل نیا گیت گاتا ہوں۔سب مل کر مجھے سہارا دیتے رہو۔

(گاتا ہے)،

باورچی خانے میں ایک چوہا
مکھن چرا کر کھاتا تھا
اس کے توند نکل آئی تھی،
جیسے ڈاکٹر لوتھر کی
باورچن نے اس کو زہر دیا؛
تب بیچارے کا یہ حال ہوا
جیسے عشق کا درد اٹھے۔

کورس: (چلا کر)

جیسے عشق کا درد اٹھے

برانڈ:

وہ اچھلا کودا' بھاگا دوڑا
اور منوں پانی پی گیا،

جو چیز ملی کاٹی کتری
مگر نہ اس کی ایک چلی؛
زہر بنا جی کا جنجال
ایسا ہو گیا ابتر حال
جیسے عشق کا درد اٹھے۔
جیسے عشق کا درد اٹھے

برانڈر:

دن دوپہر وہ ڈر سے اندھا
باورچی خانے میں آیا؛
چولہے پر گر کر لگا تڑپنے
سسک سسک کر پنجے رگڑنے؛
ظالم باورچن خوب ہنسی
لو اب موئے کی قضا آئی
جیسے عشق کا درد اٹھے
جیسے عشق کا درد اٹھے

زیبل: دیکھو یہ بدمذاق کیسے خوش ہو رہے ہیں گویا چوہے کو زہر دینا بڑا کمال ہے۔

برانڈر: تجھے چوہے سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔

آلٹ مائر: بات یہ ہے کہ اس کی بھی توند بڑی ہے سر گنجا ہے اور مصیبت نے اسے پلپلا کر دیا ہے۔ پھولے ہوئے چوہے کی شکل میں اسے اپنی تصویر نظر آتی ہے۔

(فاؤسٹ اور شیطان باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

شیطان: سب سے پہلے میں تجھے رندوں کی صحبت میں لے جاؤں گا تاکہ تجھے معلوم ہو کہ انسان کس طرح مزے میں بے فکری سے زندگی گزار سکتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے دن عید ہے اور رات شب برات۔ ان میں سمجھ تھوڑی ہے اور خوش مزاجی بہت ہے اور اپنے چھوٹے سے حلقے میں مگن ہیں۔ جیسے بلی اپنی دُم سے کھیلتی ہے۔ جب تک ان کے سر میں درد نہ ہو اور سرائے والا قرض

دے جائے چین سے گزرتی رہے گی۔

آلٹ مائر: یہ دونوں مسافر معلوم ہوتے ہیں' ان کے انوکھے لباس سے ظاہر ہے کہ انہیں ہمارے شہر میں آئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔

فروش: یار تو سچ کہتا ہے' ہمارے لائپزش کی کیا بات ہے یہ بھی ایک چھوٹا سا پیرس ہے یہاں کے لوگ بڑے بانکے ہیں۔

ریبل: اور تو ان اجنبیوں کو کیا سمجھتا ہے۔

فروش: ابے چپ رہ تجھے کیا تمیز ہے۔ میں شراب کا ایک جام پلا کر ان کا کچھ چٹھا پوچھ لوں گا۔ ظاہر میں تو شریف زادے معلوم ہوتے ہیں دیکھ کیسے ناک بھوں چڑھائے ہیں۔

برانڈر: میں تو سمجھتا ہوں ڈھنڈھورچی ہیں۔ آؤ شرط کر لو۔

آلٹ مائر: شاید ایسا ہی ہو۔

فروش: ٹھہرو میں انہیں اُلو بناتا ہوں۔

شیطان: (فاؤسٹ سے) یہ لوگ شیطان کو کبھی نہیں پہنچانتے چاہے وہ ان کے سر پر سوار ہو۔

فاؤسٹ: صاحبو سلام۔

زیبل: سلام بھائی سلام (شیطان کو کنکھیوں سے دیکھ کر) ارے یہ تو لنگڑاتا ہے۔

شیطان: کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں؟ یہاں اچھی شراب تو ملے گی نہیں' خیر اس کے بدلے اچھی صحبت سہی۔

آلٹ مائر: معلوم ہوتا ہے دولت نے آپ کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔

فروش: غالباً آپ 'ریپاخ' سے دیر میں چلے تھے؟ کیا آپ نے رات کا کھانا ''ہانس'' صاحب کے ساتھ کھایا تھا۔

شیطان: آج ان کی سرائے کے پاس سے گزرے تھے اور ان سے باتیں ہوئی تھیں وہ آپ لوگوں کا دیر تک ذکر کرتے رہے اور چلتے وقت کہنے لگے میرے چچیرے بھائیوں کو میرا سلام کہہ دینا۔ (فروش کے آگے تعظیماً جھکتا)

آلٹ مائر: (آہستہ سے) اب کہو بچہ۔ ابے وہ بڑا منجھا ہوا ہے۔

فروش: ذرا صبر کر میں اسے ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔

شیطان: میرا خیال ہے کہ ابھی یہاں بھرائی ہوئی آوازیں کورس کا گیت گا رہی تھیں۔ اس چھت میں گانے کی آواز خوب گونجتی ہوگی۔

فروش: آپ کو بھی اس فن میں کچھ دخل ہے۔

شیطان: جی نہیں شوق تو بہت ہے مگر آتا جاتا خاک نہیں۔

آلٹ مائر: اجی ایک گیت سو سنایئے۔

شیطان: ایک کیا جتنے کہیے سنا دوں۔

زیبل: مگر شرط یہ ہے کہ بالکل نئی چیز ہو۔

شیطان: ہم ''اسپین'' جیسے خوبصورت ملک سے آ رہے ہیں جو شراب کا اور موسیقی کا گھر ہے۔ (گاتا ہے)

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔
اس نے ایک بڑا پسّو پالا۔

فروش: واہ وا! پسّو! سنتے ہو بھئی؟ پسّو سے اچھا مہمان کون ہوگا۔

شیطان: (گاتا ہے)

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔
اس نے ایک بڑا پسّو پالا؛
وہ پسّو کو اتنا چاہتا تھا؛
جتنا اپنے بیٹے کو۔
اس نے ایک درزی بلوایا؛
درزی ہانپتا کانپتا آیا؛
اس نے پسّو کے کپڑے سیئے؛
'اچکن' 'کرتا' 'پاجامہ'،

برانڈر: درزی کو ذرا تاکید کر دو کہ ٹھیک ٹھیک ناپ لے، اگر اسے اپنی جان پیاری ہے تو پاجامے میں جھول نہ پڑنے پائے۔

شیطان: (گاتا ہے)
مخمل اور ریشم کے کپڑے۔
پہن کر پسو لگا اکڑنے۔
کپڑوں میں سلمے ستارے تھے؛
اور ایک صلیب لٹکی تھی۔
اب وہ بن گیا وزیراعظم
اور اس کے بھائی بندوں کو
دربار میں اونچے عہدے ملے؛
دربار کے سارے امیر امراء
اپنی جان سے عاجز تھے۔
ملکہ اور خواصوں کو
پسو کاٹا کرتے تھے؛
ان کی اتنی مجال نہ تھی
چونک پڑیں یا کھجلائیں
لوگو کیسا ظلم ہے یہ
کاٹے اور کھانے نہ دے۔
لوگو کیسا ظلم ہے یہ
کاٹے اور کھانے نہ دے۔

فروش: شاباش! شاباش! بڑے مزے کا گیت تھا۔
زیبل: (چٹکی مل کر) پسو کے ساتھ یہ کرنا چاہیے۔
برانڈر: بس پکڑ کر چٹکی میں مسل دے۔
آلٹ مائر: زندہ باد آزادی! زندہ باد شراب!
شیطان: میں آزادی کا جام صحت ضرور پیتا مگر تمہاری شراب کسی کام کی نہیں۔
زیبل: خبردار! یہ لفظ ہمارے سامنے دوبارہ نہ کہیے گا۔

شیطان: اگر مجھے سرائے والے کی خفگی کا خیال نہ ہوتا تو ان معزز مہمانوں کی خدمت میں شراب پیش کرتا۔

زیبل: بسم اللہ کیجئے۔ سرائے والا کچھ کہے تو میرا ذمہ۔

فروش: واہ اگر ایک جام پلوائیے تو کیا بات ہے مگر تھوڑی سی ہوئی تو کیا خاک امتحان ہوگا۔ میں تو تبھی فیصلہ کر سکتا ہوں جب دو چار لمبے لمبے گھونٹ چڑھاؤں۔

آلٹ مائر: (آہستہ سے) میں سمجھ گیا۔ یہ لوگ رہائین کے ملک کے ہیں۔

شیطان: ذرا ایک برما تو منگوائیے۔

برانڈر: برما کیا کیجئے گا؟ کیا آپکے پاس شراب کے پیپے ہیں؟

آلٹ مائر: آپ کے پیچھے سرائے والے کی اوزار کی ٹوکری رکھی ہے۔

شیطان: (برما اٹھا لیتا ہے اور فروش سے پوچھتا ہے)

کہئے آپ کو کون سی شراب چاہیے؟

فروش: اس کے کیا معنی؟ کیا آپ کے پاس کئی قسم کی شرابیں ہیں؟

شیطان: ہر شخص کو اختیار ہے جو شراب چاہے مانگے۔

آلٹ مائر: (فروش سے) کیوں بے! ابھی سے ہونٹ چاٹنے لگا۔

فروش: اچھی بات ہے اگر میری پسند پر ہے تو میں رہائین کی شراب چاہتا ہوں۔ جو چیزیں ہمارے دیس میں ہیں کہیں نہیں۔

شیطان: (فروش کے قریب میز کے کنارے سوراخ کرتا ہے)

تھوڑا سا موم لاؤ اس سے بوتل کا کاگ بنائیں۔

آلٹ مائر: ارے یہ تو مداری کا کھیل نکلا۔

شیطان: (برانڈر سے) آپ کو کیا چاہیے؟

برانڈر: مجھے شیمپین پلائیے مگر خوب جھاگ اٹھتا ہو۔ (شیطان سوراخ کرتا ہے۔ اسی اثنا میں کسینے موت کی ڈاٹیں بنا کر سراخوں میں لگا دی ہیں)

برانڈر: بدیشی مال سے آدمی ہمیشہ نہیں بچ سکتا۔ اکثر اچھی چیزیں پردیس سے آتی ہیں۔ سچا جرمن فرانسیسیوں کا دشمن ہوتا ہے مگر ان کے دیس کی شراب شوق سے پیتا ہے۔

زیبل: (شیطان سے جو اس کے پاس آ کر کھڑا ہے) ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے کھٹی شراب پسند نہیں مجھے تو میٹھی میٹھی پلوائیے۔

شیطان: (سوراخ کرتا ہے) ابھی دم بھر میں آپ کو ٹو کے ملے گی۔

آلٹ مائز: حضرت ذرا آنکھ سے آنکھ تو ملائیے۔ میں سمجھ گیا آپ ہمیں اُلو بنا رہے ہیں۔

شیطان: واہ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ میری مجال ہے کہ ایسے معزز مہمانوں سے مذاق کروں۔ جلد بتائیے آپ کی خدمت میں کون سی شراب پیش کی جائے۔

آلٹ مائز: جو جی چاہے مجھ سے نہ پوچھئے۔

(سب کے سامنے میز میں سوراخ ہو گئے اور ان میں ڈاٹیں لگا دی گئیں)

شیطان: (عجیب شکل بنا کر) تاک انگور کی مالا ہے۔ بکرا سینگوں والا ہے۔ شراب عرق ہے تاک لکڑی۔ لکڑی کی میز سے شراب نکلے۔ بوجھو فطرت کی پہیلی۔ دیکھو قدرت کا کھیل۔ ہٹاؤ کاگ اور پیو شراب۔

(سب کاگ ہٹاتے ہیں اور ابلتی ہوئی شراب گلاسوں میں بھرتے ہیں)

سب مل کر

واہ کیا خوب چشمہ ہے۔

شیطان: مگر خبردار! کوئی قطرہ گرنے نہ پائے۔

(وہ بار بار گلاس بھر کر پیتے ہیں)۔

(سب مل کر گاتے ہیں)

ہم سب بن گئے مردم خوار۔

جیسے پانسو سور ہوں۔

شیطان: واہ کیا آزاد قوم ہے! دیکھو کیسے مزے میں ہے!

فاؤسٹ: میرا تو جی چاہتا ہے یہاں سے چل دوں۔

شیطان: ذرا دیکھتے جاؤ ان کی بہیمیت کیا کیا گل کھلاتی ہے۔

زیبل: (بے احتیاطی سے پیتا ہے شراب زمین پر گر کر شعلہ بن جاتی ہے) دوڑو! دوڑو! آگ لگی! جہنم کی آگ۔

شیطان: (شعلے سے مخاطب ہو کر) اے میرے دوست اے آتشی عنصر خاموش ہو جا۔
(دوستوں سے) یہ تو محض اعراف کا ایک شعلہ تھا۔
زیبل: یہ کیا مذاق ہے؟ ٹھہریئے ابھی آپ کی مرمت کی جاتی ہے۔ آپ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟
فروش: اب کی کرو تو بتا دوں۔
آلٹ مائر: میں تو سمجھتا ہوں ان سے کہو چپ چاپ یہاں سے دفان ہوں۔
زیبل: کیا ڈھیٹ ہے! ہمارے ہی گھر میں ہماری آنکھوں میں خاک جھونکتا ہے۔
شیطان: اب چپ! شراب کے پرانے پیپے۔
زیبل: بدتمیز کہیں کا! اوپر سے اور ڈراتا ہے۔
برانڈر: ٹھہر جا! ابھی تیری کندی بنتی ہے۔
آلٹ مائر: (میز سے موم نکالتا ہے آگ بھڑک اٹھتی ہے) ارے میں جلا! میں جلا!
زیبل: یہ سب شعبدے بازی ہے۔ لگاؤ ایک ہاتھ۔ اس کا خون معاف ہے۔ (سب چاقو نکال کور دوڑتے ہیں)
شیطان: (ہیبت ناک شکل بنا کر) جھوٹے لفظوں، خیالی تصویرو ادھر ادھر پھیل جاؤ۔ نظر بندی کر کے سین بدل دو۔
(وہ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔)
آلٹ مائر: میں کہاں ہوں! کیسی خوبصورت جگہ ہے۔
فروش: انگور کا باغ! یہ کیا بھید ہے؟
زیبل: اور سامنے انگور کے خوشے ہیں!
برانڈر: دیکھو کنج کے نیچے! کیسی ہری بھری بیلیں ہیں۔ (زیبل کی ناک پکڑ لیتا ہے اور سبھی ایک دوسرے کی ناک پکڑ کر چاقو اٹھاتے ہیں)
شیطان: (ڈراؤنی شکل میں) نظر کے دھوکے ان کی آنکھیں کھول! اب دیکھو شیطان کا مذاق۔
(فاؤسٹ کو لے کر غائب ہو جاتا ہے، دوست ایک دوسرے کی ناک چھوڑ دیتے ہیں)۔

زیبل: یہ کیا!

آلٹ مائر: ہائیں!

فروش: ارے یہ تیری ناک تھی؟

برانڈر: (زیبل سے) اور تیری میرے ہاتھ میں ہے!

آلٹ مائر: ارے میرے بدن میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی! لاؤ ایک تپائی میں گرتا ہوں!

فروش: یارو یہ تو بتاؤ یہ ماجرا کیا تھا؟

زیبل: کہاں گیا وہ بدمعاش! پاؤں تو کچا چبا جاؤں!

آلٹ مائر: میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ پیپے پر سوار تہ خانے کے دروازے سے نکل گیا۔ ارے میرے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ (میز کی طرف مڑ کر) کیا شراب اب بھی ابلتی ہے۔

زیبل: سب دھوکا تھا! دغا! فریب!

فروش: مگر پیتے وقت تو شراب معلوم ہوتی تھی۔

برانڈر: مگر یہ انگوروں کا کیا معاملہ تھا۔

آلٹ مائر: اب بھی کہہ دے کہ جادو جھوٹ ہے۔

جادوگرنی کا باورچی خانہ

(ایک نیچے چولہے پر ایک بڑا کڑھاؤ چڑھا ہوا ہے۔ اس میں سے بخارات اٹھ رہے ہیں جن میں عجیب عجیب شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ ایک لنگور کی مادہ کڑھاؤ کے پاس بیٹھی اُبال اتار رہی ہے۔ لنگور اپنے بچوں کے ساتھ پاس ہی بیٹھا آگ تاپ رہا ہے۔ دیواریں اور چھت عجیب و غریب جادو کی چیزوں سے آراستہ ہیں) (فاؤسٹ اور شیطان داخل ہوتے ہیں)

فاؤسٹ: مجھے اس جادو کے بکھیڑے سے وحشت ہوتی ہے۔ کیا تو اس کا ذمہ لیتا ہے کہ اس طوفان بے تمیزی میں میری جوانی عود کر آئے گی؟ کیا میں اس بڑھیا کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟ کیا یہ دیوانی ہانڈی میری عمر کے تیس سال واپس دے دے گی؟ اگر تیرے پاس اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں تو پھر میرا خدا ہی حافظ ہے۔ میرے دل سے رہی سہی امید بھی جاتی رہی کیا فطرت نے اور عقل برتر نے کوئی معجون ایسا نہیں بنایا جس سے گئی ہوئی جوانی لوٹ آئے؟

شیطان: ایک دوسرا نسخہ بھی ہے مگر وہ کتاب ہی اور ہے وہ باب ہی دوسرا ہے۔

فاؤسٹ: میں تو اسے معلوم کر کے رہوں گا۔

شیطان: اچھا اگر تو اصرار کرتا ہے تو وہ تدبیر سن جس میں نہ کچھ خرچ ہے نہ طبیب کی مدد درکار ہے نہ جادو کی ضرورت ہے۔ تو ابھی دم کھیت میں چلا جا اور پھاوڑا اور کدال چلانا شروع کر دے۔ اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو محدود رکھ۔ سادی غذا کھایا کر۔ جانوروں کے ساتھ جانور بن کر رہ اور کھیت میں اپنے ہاتھ سے کھاد ڈالنے سے نہ شرما۔ یقین جان اسی[1] برس کی عمر میں جوان بننے کے لیے اس سے اچھی کوئی تدبیر نہیں۔

فاؤسٹ: اس کی مجھے عادت نہیں۔ نہ مجھ سے پھاوڑا چلاتے بنتا ہے اور نہ یہ محدود زندگی میرے طبیعت کے مناسب ہے۔

شیطان: تو پھر جادوگرنی کا احسان اٹھانا پڑے گا۔

فاؤسٹ: مگر کیا ضرور ہے کہ اس چڑیل کے پاس جائیں؟ کیا تو خود یہ شربت تیار نہیں کر سکتا؟

شیطان: واہ کیا اچھا مشغلہ ہے! اتنے عرصہ میں تو میں خدا جانے کتنے کام کر ڈالوں۔ ان چیزوں کے لیے محض علم و فن کافی نہیں، بڑے صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔ کسی خاموش طبیعت والے کو برسوں کام کرنا پڑتا ہے۔ جتنے زیادہ دن تک یہ حریرہ پکتا ہے اتنی ہی اس کی قوت بڑھتی ہے۔ اس کے اجزاء بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ نسخہ شیطان ہی کا بتایا ہوا ہے لیکن اس کا بنانا اس کے بس کی بات نہیں۔

(جانوروں کو دیکھتا ہے)

دیکھ کیسے خوبصورت جانور ہیں! یہ جادوگرنی کی لونڈی ہے یہ غلام۔ (جانوروں سے) معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری مالکہ گھر پر نہیں ہے۔

جانور: دود کش کی راہ گھر سے نکل کر پینے پلانے گئی ہے۔

شیطان: آخر کتنی دیر پیتی رہے گی۔

---

1 اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاؤسٹ کی عمر 80 برس کی ہے۔ اس کی عمر 50 سے زیادہ نہیں۔ شیطان ایک عام بات کہتا ہے کہ کاشتکاری کی صحت بخش زندگی 80 برس کے بڈھے کو بھی جوان بنا دیتی ہے۔

جانور: اجتنی دیر ہم اپنے پیر سینک لیں۔

شیطان: (فاؤسٹ سے) تجھے یہ نازک جانور پسند آئے یا نہیں۔

فاؤسٹ: لاحول ولا قوۃ! میں نے ایسی مکروہ مخلوق آج تک نہیں دیکھی۔

شیطان: واہ! ان سے باتیں کرنے میں مجھے بڑا مزا آتا ہے (جانوروں سے) شیر یرکھ چلیو! تم کڑھاؤ کے گرد کیوں گھوم رہی ہو۔

جانور: ہم ابدلطیف کا چٹپٹا شوربا پکاتے ہیں۔

شیطان: شاباش! پھر تو خریداروں کی کمی نہ ہوگی۔

لنگور: (شیطان کے قریب آ کر خوشامد سے دم ہلاتا ہے)

مالک ذرا پانسہ پھینک
مجھے جتا کر امیر کر دے
آج کل حال پتلا ہے
روپیہ ملے تو کام چلے

شیطان: اگر اس لنگور کے نام کوئی لاٹری نکل آئے تو یہ کتنا خوش ہو۔

(لنگور ایک بڑے سے گولے سے کھیل رہے ہیں اور اسے لڑھکا رہے ہیں)

لنگور

اس کا نام دنیا ہے،
یہ چڑھتی ہے اور گرتی ہے؛
ہمیشہ لڑھکتی رہتی ہے۔
اس میں ہے شیشہ کی جھنکار،
اور اندر سے ہے کھوکھلی؛
ہاتھ لگایا اور ٹوٹی؛
دیکھو اس کی تیز چمک،
جس سے آنکھ چمکتی ہے،

داوری میری زندگی!

سن لے میرے پیارے پوت۔

اس دنیا کے پاس نہ جا۔

اس میں تیری موت ہے۔

یہ ایک مٹی کا گولہ ہے۔

ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گا یہ۔

شیطان: یہ چھلنی کیسی ہے؟

لنگور: (اسے اتار کر لاتا ہے) اگر تو چور ہے تو ہم اس کے ذریعے سے پہچان لیں گے۔ (وہ چھلنی مادہ کو دیتا ہے، مادہ اس میں سے جھانکتی ہے) لے اس میں سے جھانک کیا تو نے چور کو پہچان لیا اور نام لیتے ڈرتی ہے؟

شیطان: (قریب جا کر) یہ ہانڈی کیسی ہے؟

لنگور: واہ بے اُلّو! ہانڈی اور کڑھائی کی بھی پہچان نہیں۔

شیطان: بڑا بدتمیز جانور ہے۔

لنگور: لے یہ پنکھا لے اور مونڈھے پر بیٹھ جا۔

(وہ شیطان کو بہ اصرار بٹھاتا ہے)

فاؤسٹ: (ایک آئینے کے پاس کھڑا ہے، کبھی قریب جاتا ہے، کبھی دور ہٹتا ہے) یہ کیا دیکھتا ہوں؟ اس جادو کے آئینے میں کیسی حسین شکل نظر آتی ہے۔ اے عشق مجھے اپنے تیز پنکھ پر اڑا کر اس کی گلی میں لے چل۔ اگر میں اس جگہ سے ایک قدم بھی آگے بڑھتا ہوں تو یہ شکل کہر میں چھپ جاتی ہے۔ دنیا کی سب سے حسین عورت کی تصویر! کیا واقعی کوئی عورت اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے؟

یہ محو راحت پیکر ناز میری نظر میں آسمانوں کے روحانی حسن کا جوہر ہے۔

کیا ایسی حسینہ سطح زمین پر موجود ہے؟

بے شک جب خدا چھ[1] روز تک خلاقی کا کمال دکھائے اور آخر میں خود اپنی صنعت پر آفریں کہے تو ایسی چیز کا بن جانا کیا تعجب ہے۔ اس وقت تو اس تصویر کو جی بھر کے دیکھ۔ پھر میں تیرے

1۔ بائبل میں لکھا ہے کہ خدا نے دنیا کو 6 دن میں پیدا کیا۔

لیے یہ گوہر بے بہا ڈھونڈ نکالوں گا۔ خوشحال اس کے جو خوبی تقدیر سے اسے دولہا بن کر بیاہے۔
(فاؤسٹ برابر اس تصویر کو دیکھے جاتا ہے۔ شیطان پیر پھیلائے مونڈھے پر دراز ہے اور پنکھے سے کھیل رہا ہے۔ وہ اپنی تقریر کو جاری رکھتا ہے) دیکھ میں یہاں تخت پر بادشاہ بنا بیٹھا ہوں! عصائے شاہی میرے ہاتھ میں ہے بس تاج کی کسر ہے۔
لنگور: (جواب تک عجب طرح سے اچھل کود رہے تھے شیطان کے لیے ایک تاج لاتے ہیں اور خوشی کے نعرے لگاتے ہیں)۔
لے مالک یہ تاج ہے۔
خون اور پسینے سے،
سر پر چپکا لے۔
(وتاج کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہیں' تاج دو ٹکڑے ہو جاتا ہے' لنگور اچھل پڑتے ہیں)۔
جو ہونا تھا وہ ہو گیا،
ہم دیکھتے رہ گئے،
ہائے مرے! ہائے مرے!
فاؤسٹ: (آئینے کے قریب) ہائے! میں تو دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔
شیطان: (جانوروں کی طرف اشارہ کر کے) میرا خود سر چکرا رہا ہے۔
لنگور: تقدیر کی یاوری۔
زمانے کی دوستی۔
خیال ہی خیال ہے۔
فاؤسٹ: میرے سینے میں آگ سی لگی ہے! اچل یہاں سے جلدی چل۔
شیطان: (بدستور جانوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کم سے کم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ان کی شاعری سچی ہے۔
(کڑھاؤ جس کی طرف سے لنگور کی مادہ غافل ہے' ابلنے لگتا ہے' ایک بڑا سا شعلہ اٹھتا ہے اور روودان کے باہر پہنچتا ہے شعلے میں سے جادوگرنی چیختی ہوئی اترتی ہے)
ہائے جلی! ہائے جلی!

نصیبوں پیٹے جانور،
مردار! سور!
کڑھاؤ کو چھوڑ دیا!
مجھ کو جلا دیا!
نصیبوں پیٹے جانور!
(فاؤسٹ اور شیطان کو دیکھ کر)

یہ کیا ماجرا ہے؟ تم کون ہو؟ یہاں کس لیے گھس آئے؟ ٹھہرو تمہارے پاؤں آگ سے جھلستی ہوں۔

(کڑھاؤ میں کفگیر چلاتی ہے اور فاؤسٹ شیطان اور لنگوروں پر شعلے پھینکتی ہے، لنگور واویلا مچاتے ہیں)

شیطان: (پنکھے کی ڈنڈی سے ہانڈیاں اور پیالے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے)
دو ٹکڑے! دو ٹکڑے!
لے یہ تیرا حریرہ ہے،
لے یہ تیرے پیالے ہیں!
تو گاتی ہے میں بجاتا ہوں!
(جادوگرنی غصے اور ہول سے کانپتی ہوئی پیچھے ہٹتی ہے)

اب تو نے مجھے پہچانا، ہڈیوں کی مالا! مرگھٹ کی بھتنی! اپنے آقا کو پہچانا؟ کچھ سوچ کے رہ جاتا ہوں، نہیں تیرے اور تیری لنگوری روحوں کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ چڑیل کہیں کی! اس لال صدری کا ادب نہیں کرتی؟ اس مرغے کے پر کو نہیں پہچانتی؟ میری صورت نہیں دیکھتی؟ کیا مجھے نام بتانے کی ضرورت ہے؟

جادوگرنی: میرے مالک، میری خطا معاف کر دیجئے! مگر آپ کے سم کہاں ہیں اور آپ کے دونوں کالے کوے کیا ہوئے؟

شیطان: جاب کی بار میں تجھے معاف کرتا ہوں کیونکہ تو نے سچ مچ مجھے بہت دن کے بعد دیکھا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ساری دنیا کی طرح مجھ پر بھی تہذیب نے صیقل کر دی ہے، وہ پرانا شمالی

ہوا اب نظر نہیں آتا۔ سینگ اور دم اور پنجے غائب ہو گئے! البتہ پیروں کو میں نہیں بدل سکتا۔ اندیشہ تھا کہ ان کے سبب سے لوگ مجھ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اس لیے سالہا سال سے میں نے بھی بہت سے نوجوانوں کی طرح مصنوعی پنڈلیاں لگائی ہیں۔

جادوگرنی: (ناچتی ہے) اس وقت میں خوشی سے اپنے آپے میں نہیں۔ مدت کے بعد آج شیطان کی زیارت ہوئی۔

شیطان: خبردار! اے عورت مجھے اس نام سے مت پکار۔

جادوگرنی: کیوں خیر تو ہے؟ اس میں کیا برائی ہے؟

شیطان: اب عرصے سے یہ نام بس کہانیوں میں رہ گیا ہے! مگر انسانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ ایک شیطان سے چھٹکارا پا گئے مگر بہت سے شیطان باقی ہیں تو مجھے نواب صاحب کہہ کر پکار۔ بس قصہ ختم۔ میں بھی اور رئیسوں کی طرح رئیس ہوں۔ اگر تجھے میری آبائی ریاست میں شبہ ہو تو میرا امارکہ دیکھ۔ (ناشائستہ اشارہ کرتا ہے)

جادوگرنی: (ہنستے ہنستے لوٹ جاتی ہے) آپ ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب تک وہی شرارت چلی جاتی ہے۔

شیطان: (فاؤسٹ سے) میرے دوست یہ باتیں تو بھی سیکھ لے۔ جادوگرنیوں سے یہی برتاؤ کرنا چاہیے۔

جادوگرنی: فرمائیے آپ کے لیے کیا حاضر کروں۔

شیطان: اس جانے بوجھے عرق کا پیالہ بھر لا مگر یاد رکھ دو آتشہ ہو۔

جادوگرنی: آپ کا حکم سر آنکھوں پر! لیجیے یہ شیشہ ہے جس میں سے میں خود کبھی کبھی ایک آدھ گھونٹ پی لیتی ہوں۔ اس میں ذرا بھی بدبو نہیں، میں خوشی سے آپ کو ایک پیالہ دیتی ہوں۔ (آہستہ سے) ان صاحب کو آپ نے پہلے سے بتا دیا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو گھنٹہ بھر میں ختم ہو جائیں۔

شیطان: یہ میرے دوست ہیں، ایسا کر کہ یہ انہیں موافق آئے۔ میں انہیں تیرے باورچی خانے کے جوہر سے محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ حلقہ کھینچ اپنا منتر پڑھ اور انہیں ایک پیالی عرق دے۔

(جادوگرنی ڈراؤنی شکل بنا کر ایک حلقہ کھینچتی ہے اور اپنے آس پاس عجیب و غریب چیزیں

رکھتی ہے، گلاسوں سے جھنکار کی آواز اور کڑھاؤ سے نغمے کی صدا آنے لگتی ہے۔ آخر میں ایک بڑی سی کتاب لاتی ہے اور لنگوروں کو حلقے میں بلا کر ایک سے ڈیسک کا کام لیتی ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں مشعل دے دیتی ہے اب وہ فاؤسٹ کو اشارے سے بلاتی ہے)۔

فاؤسٹ: (شیطان سے) آخر اس حماقت سے فائدہ؟ میں اس دیوانی ہانڈی کو اس مجنونانہ شکل کو اس ذلیل دھوکے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔

شیطان: ہاں ان بناوٹ کی باتوں پر ہنسی آتی ہے مگر اتنی نازک مزاجی سے کام نہ لے یہ اس وقت طبیب ہے اور طبیبوں کی طرح رعب گانٹھتی ہے تا کہ دوا کا اثر زیادہ ہو۔ (وہ فاؤسٹ کو زبردستی حلقہ میں دھکیل دیتا ہے)

جادوگرنی: (الفاظ پر زور دے کر کتاب میں سے منتر پڑھتی ہے)

دیکھ سمجھ لے،
ایک کے دس کر،
دو کو چھوڑ دے،
تین کو برابر کر،
پھر تیری چاندی ہے،
چار کو رکھ دے،
پانچ اور چھ کو،
سات اور آٹھ کر،
بس پھر پو بارے ہیں،
نو ایکن ایک،
دس ایکن صفر،
یہ میرا پہاڑا ہے۔

فاؤسٹ: یہ کیا ہذیان بکتی ہے۔

شیطان: ابھی تو یہ تانتا چلا جائے گا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں، ساری کتاب میں یہی پہاڑا ہے۔ میں نے اس میں بہت وقت ضائع کیا ہے کیونکہ جس چیز میں صاف تناقض ہو وہ نہ عقل مند کی سمجھ میں آتی ہے نہ بے وقوف کی۔ میرے دوست یہ فن پرانا بھی ہے نیا بھی۔ پرانے زمانے

سے لوگ تین میں ایک اور ایک میں تین کہہ کر بجائے حق کے باطل کی تعلیم دیتے آئے ہیں۔ کہنے والے اپنی کہے جاتے ہیں۔ ان احمقوں سے کون الجھے۔ انسان عموماً یہ سمجھتا ہے کہ اگر کچھ الفاظ جمع کر دیے جائیں تو ان کا کوئی نہ کوئی مطلب خواہ مخواہ نکل ہی آئے گا۔

جادوگرنی: (بدستور منتر پڑھ رہی ہے)

علم کی اونچی گہری طاقت،

ساری دنیا سے پوشیدہ،

ان کے حصے میں آتی ہے،

جن کو بالکل دھیان نہ ہو،

فاؤسٹ: یہ کیا مہملات بک رہی ہے؟ میرا سر پھرا جاتا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لاکھوں احمقوں کا کورس مل کر گیت گا رہا ہو۔

شیطان: بس' اے جادو کی رانی بس' اپنا عرق لا اور اس پیالی کو لبالب بھر دے۔ میرے دوست کو یہ نقصان نہیں کرے گی۔ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے اور نہ جانے کتنے جام پی چکا ہے۔

(جادوگرنی بڑے اہتمام سے عرق ایک پیالی میں انڈیلتی ہے' جب فاؤسٹ اسے منہ سے لگاتا ہے تو ایک چھوٹا سا شعلہ اٹھتا ہے)۔

شیطان: پی جا' ایک گھونٹ میں پی جا' یہ حلق سے اترتے ہی تیرا دل خوش کر دے گی۔ تو شیطان سے یارانے کا دم بھرتا ہے اور ذرا سے شعلے سے ڈرتا ہے۔

(جادوگرنی حلقے کو توڑتی ہے فاؤسٹ باہر آتا ہے)

شیطان: بس! یہاں سے چل تیرے لیے آرام کرنا مضر ہے۔

جادوگری: میری دعا ہے کہ یہ عرق کے دو گھونٹ تجھے اچھی طرح پچیں۔

شیطان: (جادوگرنی سے) اگر تو چاہتی ہے کہ میں تیرے ساتھ کچھ سلوک کروں تو مجھے والپرگس کی رات[1] کو یاد دلانا۔

جادوگرنی: میں ایک گیت سناتی ہوں اسے کبھی کبھی گایا کیجیے تو آپ کو اس کی تاثیر معلوم ہو۔

شیطان: (فاؤسٹ سے) جلدی کر' میرے پیچھے پیچھے چل' تجھے پسینہ آنے کی بہت سخت ضرورت ہے تاکہ عرق کی قوت سارے جسم میں اندر سے باہر تک پھیل جائے۔ آرام کا لطف اٹھانا

---

1. یکم مئی کی رات۔ جرمنی میں عوام کا عقیدہ تھا کہ اس رات کو ہارتس کے پہاڑوں پر شیطان کا دربار ہوتا ہے۔

میں تجھے اس کے بعد سکھاؤں گا۔تب تیرے دل میں خوشی کی لہر اٹھے گی۔ عشق و محبت خون بن کر رگوں میں دوڑ جائیں گے۔

فاؤسٹ :لاؤ چلتے چلتے اس آئینے کو ایک نظر اور دیکھ لوں۔ہائے کیسی پیاری شکل تھی۔

شیطان :نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ بہت جلد تجھے یہ عورتوں کی سرتاج جیتی جاگتی نظر آئے گی۔(آہستہ) اس عرق کی تاثیر سے تجھے ہر عورت ہیلن کی طرح حسین معلوم ہوگی۔

سڑک

(فاؤسٹ چلا جا رہا ہے۔مارگریٹ قریب سے گزرتی ہے)

فاؤسٹ :اے حسین صاحبزادی اگر اجازت ہو تو میں آپ کو اپنے بازو کا سہارا دے کر ساتھ چلوں۔

مارگریٹ :میں نہ صاحبزادی ہوں نہ حسین ہوں، میں اکیلی گھر جا سکتی ہوں۔(ہاتھ چھڑا کر چلی جاتی ہے)

فاؤسٹ :واللہ یہ لڑکی رشک حور ہے! ان آنکھوں نے ایسی صورت آج تک نہیں دیکھی۔ کیسی پاک باز ہے! کیسی شائستہ اور اس پر یہ تیکھی چتون! یہ لال لال ہونٹ، یہ گورے گورے گال مجھے قیامت تک نہ بھولیں گے۔اس کی یہ نیچی نظریں میرے کلیجے میں چبھ گئیں۔اس کی چھوٹی سی چوٹی دیکھ کر دل پر سانپ لوٹ گئے۔

(شیطان آتا ہے)

فاؤسٹ :سن مجھے یہ لڑکی چاہیے۔

شیطان :کون سی لڑکی

فاؤسٹ :وہی جو ابھی ابھی ادھر سے گئی۔

شیطان :اچھا وہ! وہ تو پادری سے اپنے گناہوں کی معافی لے کر آ رہی ہے۔ میں چپکے سے اس کی کرسی کے پاس سے گزرا مگر معلوم ہوا کہ معصوم لڑکی ہے، خواہ مخواہ اعتراف گناہ کی رسم پوری کرنے آئی ہے، اس پر میرا قابو نہیں۔

فاؤسٹ :مگر اس کا سن تو چودہ سے کم نہیں۔

شیطان: واہ رے میرے چھیل چھبیلے، تو سمجھتا ہے کہ جو پھول کھلتا ہے وہ تیرے ہی لیے ہے، بس ہاتھ بڑھایا اور توڑ لیا۔ مگر یاد رکھ ہمیشہ اس طرح کام نہیں چلتا۔

فاؤسٹ: بس اپنا قل اعوذیا پن رہنے دے، بڑا واعظ بن کر آیا ہے! اتنا کہے دیتا ہوں کہ اگر یہ پیکر شباب آج رات کو میرے آغوش میں نہ ہوئی تو بارہ کا گجر بجتے ہی میری تیری دوستی القط۔

شیطان: ارے میاں ابھی تو تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کچھ نہیں تو چودہ دن موقع تلاش کرنے کو چاہئیں۔

فاؤسٹ: اگر مجھے سات گھنٹے بھی ضبط کا یارا ہوتا تو ذرا سی چھوکری کو پھسلانے کے لیے شیطان کی مدد کی کون سی ضرورت تھی؟

شیطان: واہ میرے شیر تو، تو پورا فرانسیس بن گیا! بپھرا کیوں جاتا ہے اتنا سوچ کہ اگر وہ فوراً تیرے قابو میں آ گئی تو خاک لطف آئے گا۔ مزا تو جب ہے کہ کچھ دنوں ذرا چھیڑ چھاڑ رہے، تحفہ تحائف کا سلسلہ چلے، کھلونے گڑیاں بھیجی جائیں، وہ آہستہ آہستہ راہ پر لائی جائے۔ اطالیہ کے قصوں میں یہی ہوتا ہے۔

فاؤسٹ: اس طول عمل کی ضرورت نہیں۔ یہاں یوں ہی آگ لگی ہوئی ہے۔

شیطان: اچھا اب دل کی لگی برطرف، میں تجھ سے سچ کہتا ہوں یہ لڑکی ہرگز ہرگز اتنی جلدی ہاتھ نہیں آ سکتی۔ یہ قلعہ ہلہ کرنے سے فتح نہیں ہونے کا۔ ہمیں حیلے سے کام لینا پڑے گا۔

فاؤسٹ: اچھا کم سے کم اس کی کوئی چیز ہی لا دے! اس کی خواب گاہ ایک نظر دکھا دے! اس آرام جان کا گلوبند یا موزہ بند ہی مل جائے تو کچھ تسکین ہو۔

شیطان: اچھا میں آج ہی شام کو تجھے اس کے کمرے میں لے چلوں، تجھے کسی طرح یقین تو آئے کہ میں تیرے دل کی لگی بجھانے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتا۔

فاؤسٹ: اچھا وہ نظر بھی آئے گی؟ وصل بھی ہوگا؟

شیطان نہیں! وہ اپنے ہمسائی کے گھر جائے گی۔ تو اکیلا ہوگا جی بھر کے بوئے یار کی فضا میں سرشام ہو لینا اور آئندہ مسرتوں کے تصور کا لطف اٹھانا۔

فاؤسٹ: تو اب چلیں نہ؟

شیطان: نہیں ابھی بہت سویرا ہے۔

فاؤسٹ: مجھے اس کے لیے کوئی اچھا تحفہ لا دے۔

شیطان: ابھی سے تحفہ! شاباش، شاباش اب کہاں بچ کر جاتی ہے! مجھے بہت سی اچھی جگہیں اور بہت سے گڑے ہوئے خزانے معلوم ہیں۔ اب ذرا انہیں الٹ پلٹ کرنا ہے۔

شام کا وقت

ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ۔

(مارگریٹ بیٹھی چوٹی گوندھ رہی ہے)

کسی طرح یہ معلوم ہوتا کہ یہ صاحب جو راہ میں ملے تھے کون ہیں۔ دیکھنے میں تو بھلے آدمی ہیں اور عالی خاندان۔ میں ماتھے ہی سے پہچان گئی تھی اور انہوں نے کچھ ایسی شرارت بھی نہیں کی۔

(چلی جاتی ہے)

(شیطان، فاؤسٹ)

شیطان: چلے آؤ چپکے چپکے۔

فاؤسٹ: (تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد) بھائی مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔

شیطان: (ادھر ادھر جھانک کر) ہر لڑکی میں یہ سلیقہ اور ستھرا پن نہیں ہوتا۔

فاؤسٹ: (چاروں طرف دیکھ کر) مرحبا اے حریم ناز کی ہلکی ہلکی تاریکی! جندا اے محبت کے بیٹھے بیٹھے درد جو امید کی شبنم کے سہارے مر مر کے جیتا ہے! ہر طرف ایک کیف سا چھایا ہوا ہے، خاموشی کا، سکون و اطمینان کا، اس عسرت میں کیسی برکت ہے۔ اس قید خانے میں کیسی راحت ہے۔ (پلنگ کے قریب ایک چمڑے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اے آرام کرسی تو نے ہزاروں خوشی کے متوالوں اور دکھ کے ماروں کو اپنی آغوش میں جاہ دی اب مجھے بھی دم بھر گود میں لے لے۔ خدا جانے کتنی بار اس آبائی تخت کے گرد بچوں کا جھرمٹ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں کبھی ولادت مسیح کی خوشی میں میری محبوبہ بچپنے کی بھولی بھالی شکل لیے ہوئے اپنے دادا کے ہاتھ کو حسن عقیدت سے بوسہ دینے آئی ہو۔ اے نازنین میرے گرد تیری رہنما برکت اور سلیقے کی روح منڈلا رہی ہے جو شفقت مادرانہ سے تجھے روز میز پر صاف ستھری چادر بچھانے، پیروں کے نیچے ریت بکھیرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ تیرے پیارے ہاتھ دیویوں

کے سے ہیں، یہ جھونپڑی تیری ذات سے رشک بہشت بن گئی ہے...... اور یہ کیا ہے؟ (مسہری کا پردہ اٹھاتا ہے) ارے میرے دل پر کیسی ہیبت اور مسرت چھا گئی جی چاہتا ہے پہروں یہیں بیٹھا رہوں۔ اے فطرت! یہیں تو نے میٹھے میٹھے خواب دکھا کر میری فرشتہ طینت محبوب کی تربیت کی ہے۔ یہاں وہ بچپنے میں اپنے نازک دل میں زندگی کی حرارت لیے ہوئے آرام کرتی تھی اور یہیں تو نے نیکی اور پاک دامنی کے آب ورنگ سے اس کے دیویوں جیسے چہرے کا نقش بنایا۔

اور تو بتا! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ تیری روح کیوں تڑپتی ہے؟ تیرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے؟ کیا تو فاؤسٹ ہے؟ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ کیا یہ طلسمات کی فضا ہے؟ مجھے ناپاک آرزو کی خلش یہاں لائی تھی اور اب پاک محبت کا خواب بہائے لیے جاتا ہے؟ کیا ہماری ہستی زندگی کی ہواؤں کا کھلونا ہے؟ اگر وہ اس وقت آجائے تو تجھے اپنے جرم کی کیسی سزا ملے؟ تو پانچ ہاتھ کا آدمی بچوں کی طرح گھگیا کر اس کے قدموں پر گرے۔

(شیطان آتا ہے)

شیطان: جلدی چل وہ آرہی ہے

فاؤسٹ: جا! جا! میں اب کبھی نہ آؤں گا۔

شیطان: میں یہ وزنی صندوقچہ ایک جگہ سے مار لایا ہوں لے اسے اس بڑی الماری میں رکھ دے، میں تجھ سے سچ کہتا ہوں اسے دیکھ کر اس کے ہوش جاتے رہیں گے۔ میں یہ چیزیں اس لیے لایا تھا کہ تو کسی اور لڑکی کو رجھائے مگر خیر کھیل کھیل سب برابر اور بچے بچے سب ایک سے۔

فاؤسٹ: کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں اسے رکھوں یا نہ رکھوں۔

شیطان: کیا سچ مچ تمہیں اس میں بہت تردد ہے؟ شاید ان جواہرات پر تمہاری خود رال ٹپکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میری صلاح یہ ہے کہ اپنے لالچ کے عشق کی عالم افروز روشنی میں رسوا نہ کرو اور مجھے اب زحمت نہ دو۔ گر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسے کم ظرف ہو؟ مجھ سے سوائے سر کھجانے اور ہاتھ ملنے کے کچھ بن نہیں پڑتا۔

(صندوقچے کو الماری میں رکھ کر قفل لگا دیتا ہے)

بس اب یہاں سے فوراً چل دو، یقین مانو کہ وہ شمع رو موم کی طرح پگھل جائے گی مگر تم تو اس طرح آنکھیں پھیلائے ہو گویا لکچر کے کمرے میں ہو اور طبیعیات اور مابعد الطبیعیات جیتی جاگتی

تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔ چلتے ہو کہ نہیں؟ (چلے جاتے ہیں)

مارگریٹ: (ایک لیمپ ہاتھ میں لیے ہوئے) افوہ! اس کمرے میں کیسی گرمی اور گھٹن ہے۔ (کھڑکی کھولتی ہے) مگر باہر تو اتنی گرمی نہیں۔ میرے جی کا عجب حال ہوا جاتا ہے۔ خدا کرے اماں جلدی آ ئیں۔ میرے ہاتھ پاؤں میں سنسنی ہو رہی ہے۔ میں بھی کیسی ڈرپوک بے وقوف عورت ہوں!

(کپڑے اتارتی ہے اور گاتی چلی جاتی ہے)

ٹرائے میں ایک راجا تھا؛
بڑا سچا اور بڑا اچھا،
اس کی پیاری نے مرتے دم،
اس کو سونے کا جام دیا،
جام تھا اس کو جان سے بڑھ کر،
ہر دعوت میں بھر کر پیتا تھا؛
پی کر آنکھیں بھر جاتی تھیں
مرنے والی یاد آتی تھی۔
جب اس کے مرنے کا وقت آیا،
سارے شہروں کی گنتی کی۔
اور اپنے وارث کو سونپے؛
جام مگر سونپا نہ گیا۔
اس نے سب کی دعوت کی،
سارے بانکے حاضر تھے،
وہ اپنے گڑھ میں ندی کنارے
گدی کے اوپر بیٹھ گیا
بوڑھے مہا شرابی نے،
شراب کا آخری جام پیا،

اور اس پاک پیالے کو،
بیچ ندی میں پھینک دیا۔
اس نے جام کو گرتے دیکھا،
بھنور میں چکرا کے ڈوبتے دیکھا۔
اس کی آنکھیں پتھرائیں۔
اور پلک جھپکتے کچھ بھی نہ تھا۔
(وہ کپڑے رکھنے کو الماری کھولتی ہے اور زیور کا صندوقچہ دیکھتی ہے)
ارے یہ صندوقچہ یہاں کیسے آیا؟ میں تو قفل لگا کے گئی تھی۔ مگر یہ کتنا خوبصورت ہے! نہ جانے اس کے اندر کیا ہے؟ شاید کوئی شخص اسے اماں کے پاس گروی رکھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ کنجی بھی ہے۔ ذرا کھول کے تو دیکھو۔ یا اللہ! یہ کیا ہے؟ ایسی چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ کتنا بڑھیا زیور ہے؟ یہ تو اس لائق ہے کہ بیگمیں بڑے سے بڑے تہوار کے دن پہنیں۔ دیکھوں میرے گلے میں یہ مالا کیسی معلوم ہوتی ہے۔
خدا جانے یہ کس کی چیزیں ہیں؟ (مالا اور بالیاں پہنتی ہے اور آئینے کے پاس جاتی ہے)
کاش یہ بالیاں میری ہوتیں! انہیں پہن کے آدمی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ میری خوبصورتی اور میری جوانی کس کام کی۔ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر اچھی ہیں مگر انہیں کون پوچھتا ہے؟ لوگ کچھ ترس کھا کر تعریف کر دیتے ہیں۔ ارے یہ دنیا لوبھی ہے، سونے روپے پر مرتی ہے۔ ہائے غریبی! ہائے غریبی!

چہل قدمی

(فاؤسٹ اپنے خیال میں ڈوبا ہوا ٹہل رہا ہے شیطان ساتھ ہے)
شیطان: لعنت ہو رد کی ہوئی محبت پر لعنت ہو آتش جہنم پر! کاش مجھے کوئی اس سے بدتر چیز معلوم ہوتی جس پر میں لعنت بھیجتا!
فاؤسٹ: ارے تجھے کیا ہوا؟ کیا کسی نے تیرا منہ جھلس دیا؟ ایسی شکل میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

شیطان: جی چاہتا ہے اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کردوں مگر کیا کروں اتفاق سے شیطان میں ہی ہوں۔

فاؤسٹ: کیا پاگل ہو گیا ہے؟ مگر یہ دیوانوں کی سی حرکتیں تجھ پر پھبتی خوب ہیں۔

شیطان: غضب خدا کا جو زیور میں گریٹشن[1] کے لیے لاؤں اسے ایک پادری اڑا لے جائے اس کی ماں زیور کو دیکھتے ہی دل میں ڈر گئی۔ اس عورت کی ناک بڑی تیز ہے' اپنی مناجات کی کتاب کو سونگھتے سونگھتے مشاق ہو گئی ہے۔ وہ ہر چیز کو سونگھ کر معلوم کر لیتی ہے کہ پاک ہے یا ناپاک۔ زیور کو سونگھتے ہی پہچان گئی کہ اس میں برکت نہیں۔ اس نے گریٹشن سے کہا "بیٹی" حرام کا مال روح کو جکڑ دیتا ہے' خون کو چوس لیتا ہے' اسے ہم کنواری مریم کی نذر کر دیں تو ہم پر آسمان سے من و سلویٰ نازل ہو گا۔ مارگریٹے نے منہ تھتا کر کہا "میں تو سمجھتی ہوں جو چیز تحفے میں آئے وہ اپنی ہے۔ میں کبھی نہ مانوں گی۔ جو شخص ایسا اچھا تحفہ لایا تھا وہ ہرگز خدا سے دور نہیں۔" ماں نے ایک پادری کو بلایا۔ اس نے معاملے کو سمجھتے ہی دل میں کہا کہ ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ کہنے لگا "بیگم صاحبہ کا خیال بہت مبارک ہے' ضبط نفس کرنے والا اجر نیک پاتا ہے۔ کلیسا کا معدہ بہت قوی ہے وہ ملک کے ملک ہضم کر گیا اور ڈکار تک نہ لی۔ میری پیاری خواتین حرام کا مال سوائے کلیسا کے کسی کے پیٹ میں نہیں پچتا۔"

فاؤسٹ: واہ! یہ صفت اوروں میں بھی ہے۔ بادشاہوں اور یہودیوں کو بھول ہی گیا۔

شیطان: پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور مالا' کنگن اور بالیاں اٹھا کر اس بے پروائی سے جیب میں ڈال لیں گویا ٹوکری میں سے اخروٹ اٹھا لیے ہوں۔ چلتے چلتے وہ ان سے رحمت خداوندی کا وعدہ کر گیا اور وہ نہال ہو گئیں۔

فاؤسٹ: اور گریٹشن؟

شیطان: ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا دل کیا چاہتا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ دن رات زیور کو یاد کرتی ہے اور اس سے بڑھ کر زیور لانے والے کو۔

فاؤسٹ: اس آرام جان کی پریشانی پر میرا دل کڑھتا ہے۔ جا اس کے لیے اور زیور لا۔ پہلا

---

1. مارگریٹے کو پیار سے گریٹشن کہتے ہیں۔ یہ "شن" جرمن صغیر کی علامت ہے اور پیار ظاہر کرنے کے لیے اشخاص اور اشیاء کے ناموں کے آخر میں لگا دیا جاتا ہے۔

تو کچھ یوں ہی سا تھا۔

شیطان: جی ہاں آپ کے نزدیک یہ بچوں کا کھیل ہے۔

فاؤسٹ: جو میں کہتا ہوں اسے سن۔ اس کی ہمسائی سے ربط ضبط پیدا کر۔ جا جلدی زیور لا۔ تو شیطان ہے کہ ٹھیا پھوس۔

شیطان: بہت اچھا سرکار، سر آنکھوں سے۔

(فاؤسٹ چلا جاتا ہے)

یہ عاشق بھی نرے اُلو ہوتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اپنی محبوبہ کا دل لبھانے کے۔لیے چاند سورج اور ستاروں کو پھلجھڑی کی طرح چھڑا دیں۔

ہمسائی کا مکان

(مارتھے اکیلی ہے)

خدا میرے پیارے شوہر کی خطا بخشے، اس نے میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ آپ تو ساری خدائی کی سیر کرتا پھرتا ہے اور مجھے یہاں رانڈ سی بنا کے چھوڑ گیا ہے۔ اللہ جانتا ہے میں نے اسے کبھی دکھ نہیں دیا۔ اسے اپنی جان سے عزیز رکھا۔ (روتی ہے) کہیں ایسا نہ ہو وہ مر گیا ہو۔ ہائے میرے اللہ۔ اور میرے پاس اس کی موت کا تصدیق نامہ تک نہیں۔

(مارگریٹے آتی ہے)

مارگریٹے: بی بی مارتھے!

مارتھے: اری کیا ہے گریٹشن؟

مارگریٹے: ارے میں تن بدن سے کانپتی جاتی ہوں۔ اسی طرح کا ایک آبنوسی صندوقچہ پھر میری الماری میں رکھا ہے اور اس میں پہلے سے بھی بڑھیا زیور ہیں۔

مارتھے: اپنی ماں سے نہ کہنا، نہیں تو وہ پھر پادری کے حوالے کر دے گی۔

مارگریٹے: ذرا ایک نظر دیکھو تو!

مارتھے: (زیوروں کو کپڑے سے صاف کرتی ہے)

تو بھی کتنی خوش نصیب ہے۔

مارگریٹ: مگر افسوس میں انہیں پہن کر سڑکوں پر اور گرجا میں لوگوں کو دکھا نہیں سکتی۔

مارتھے: تو چپکے سے میرے یہاں چلی آیا کر اور زیور پہن کر دو گھڑی آئینے کے سامنے ٹہلا کر' ہم دونوں کا جی خوش ہوگا۔ پھر موقع سے دعوتوں میں پہن کر جانا رفتہ رفتہ کھلے بندوں پہننا شرع کر دینا۔ پہلے مالا پھر بالیاں' پھر اور چیزیں۔ اللہ چاہے تو تیری ماں کی نظر بھی نہیں پڑے گی اور جو دیکھ بھی لیا تو کوئی بات بنا دیں گے۔

مارگریٹ: خدا جانے کون یہ دونوں صندوقچے لایا۔ یہ باتیں کچھ ٹھیک نہیں۔

(کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے)

الٰہی خیر! کہیں اماں تو نہیں۔

مارتھے: (دروازے کے سوراخ سے جھانکتی ہے) کوئی اجنبی ہیں تشریف لائے ہیں۔

(شیطان داخل ہوتا ہے)

شیطان: دونوں خاتونوں سے معافی چاہتا ہوں کہ اس بے تکلفی سے اندر چلا آیا۔

(مارگریٹ کو دیکھ کر ادب سے پیچھے ہٹتا ہے)

میں بیگم مارتھے شویرٹ لائن کے پاس حاضر ہوا ہوں۔

مارتھے: یہ میرا ہی نام ہے فرمائیے کیا کہنا ہے۔

شیطان: (مارتھے سے مخاطب ہو کر آہستہ) اب میں نے آپ کو پہچان لیا۔ اس وقت یہ معزز خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میری جسارت کو معاف فرمائیے۔ سہ پہر کو پھر حاضر ہوں گا۔

مارتھے: (بلند آواز سے) سنا مارگریٹ یہ صاحب تجھے معزز خاتون سمجھتے ہیں۔

مارگریٹ: میں تو ایک غریب لڑکی ہوں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے جو آپ ایسا خیال کرتے ہیں۔ یہ زیور میرے نہیں ہیں۔

شیطان: کچھ زیور پر موقوف نہیں ان کے چہرے بشرے سے ان کی نظروں سے شرافت ٹپکتی ہے۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ مجھے ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہیں۔

مارتھے: آپ کیسے تشریف لائے مجھے بہت اشتیاق ہے کہ.....

شیطان: کاش میں کوئی اچھی خبر لاتا مگر امید ہے کہ آپ مجھے قصوروار نہ ٹھہرائیں گی۔ آپ کے شوہر نے انتقال کیا اور مرتے وقت آپ کو یاد کرتے تھے۔

مارتھے: مر گیا میرا چاہنے والا؟ ہائے ستم! ہائے میرا شوہر دنیا سے اٹھ گیا! ارے میرا جی ڈوبا!

مارگریٹ: پیاری خاتون جی کو سنبھالیے۔

شیطان: مجھے یہ دل خراش خبر پوری تو کر لینے دیجئے۔

مارگریٹ: میں جیتے جی کسی سے دل نہ لگاؤں گی۔ اگر اپنے چہیتے کی سنائی سنوں تو خدا جانے کیا حال ہو۔

شیطان: ہر خوشی کے بعد غم ہے ہر غم کے بعد خوشی۔

مارتھے: ان کے آخری وقت کا حال سنایئے۔

شیطان: وہ پیڈوا میں سینٹ انطونی کے مزار کے پاس دفن ہیں جگہ تو بڑی مقدس ہے مگر ذرا دھوپ آتی ہے۔

مارتھے: انہوں نے کچھ اور کہلا بھیجا ہے؟

شیطان: ہاں ایک وصیت ہے، بہت اہم اور بہت مشکل۔ ''میری بیوی سے کہنا میرے لیے تین سو نمازیں پڑھوائے

افسوس! میری جیب بالکل خالی ہے۔''

مارتھے: غضب خدا کا! کوئی ذرا سی یادگار بھی نہیں؟ کوئی زیور بھی نہیں؟ مزدور تک اپنی گدڑی میں یادگار کے طور پر کچھ بچا رکھتے ہیں اور چاہے فاقے کریں بھیک مانگیں مگر اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔

شیطان: بیگم صاحبہ مجھے سخت افسوس ہے میں آپ سے سچ کہتا ہوں انہوں نے کبھی فضول خرچی نہیں کی۔ انہیں بھی اپنے قصور پر ندامت تھی۔ اپنی بدنصیبی کو روتے تھے۔

مارگریٹ: ہائے دنیا میں کیسے بدنصیب انسان ہیں! میں ان کی بخشش کے لیے دعا کروں گی۔

شیطان: تمہاری تو اب شادی کی عمر ہے۔ بڑی پیاری لڑکی ہو۔

مارگریٹ: نہیں صاحب مجھ سے کون شادی کرتا ہے۔

شیطان: جب تک شوہر نہیں آشنا ہی سہی۔ ایسی نازنین کی آغوش خدا کی بڑی نعمت ہے۔

مارگریٹ: ہمارے یہاں یہ دستور نہیں۔

شیطان: دستور ہو یا نہ ہو کرنے والے کرتے ہیں۔

مارتھے: کچھ اور بیان کیجئے۔

شیطان: میں اس کے بستر مرگ کے قریب کھڑا تھا۔ وہ گھوڑے پر نہیں مرا بلکہ سڑی ہوئی پیال پر مگر مرتے دم تک عیسائیت پر ایمان رکھتا تھا۔

''مجھے خود اپنی زندگی سے نفرت ہوتی ہے۔ آہ! مجھے کمبخت نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ اپنا کاروبار برباد کر دیا۔ ہائے! یہ خیال مجھے مارے ڈالتا ہے۔ کاش وہ میرا قصور اسی زندگی میں معاف کر دیتی!''

مارتھے: (روتی ہے) کیا نیک آدمی تھا میں نے معاف کیا میرے خدا نے معاف کیا۔

شیطان: آخر میں اتنا اور کہا ''مگر اللہ جانتا ہے میری بیوی مجھ سے زیادہ قصور وار تھی۔''

مارتھے: جھوٹا کہیں کا مرتے وقت بھی جھوٹ سے باز نہ آیا۔

شیطان: ہاں میں تاڑ گیا تھا کہ یہ نزع کے عالم میں فقرے گھڑ رہا ہے۔ کہنے لگا ''مجھے دم بھر تفریح کی فرصت نہ ملتی تھی ایک تو بچے پیدا کرنا' دوسرے ان کے لیے روٹی اور روٹی کیا' سبھی کچھ مہیا کرنا' پھر گھر والی کی یہ حالت کہ دو نوالے چین سے کھانا دشوار کر دیتی تھی۔''

مارتھے: ارے وہ میری ساری محبت' وفاداری' دن رات کی جفاکشی بھول گیا؟

شیطان: نہیں' نہیں وہ تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ مالٹا سے چلتے وقت میں نے بیوی بچوں کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگی اور خدا کے فضل سے ایک ترکی جہاز جس میں سلطان کا خزانہ جا رہا تھا ہمارے ہاتھ آ گیا۔ ان سب لوگوں کو جنہوں نے بہادری دکھائی تھی انعام بانٹے گئے اور مجھے بھی میرے استحقاق کے مطابق معقول حصہ ملا۔

مارتھے: اچھا! تو پھر وہ کیا ہوا؟ کیا کہیں دفن ہے؟

شیطان: خدا جانے چاروں سمت کی ہواؤں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب تمہارا شوہر نیپلز میں پردیسیوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہا تھا تو ایک حسین دوشیزہ نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور ایسی محبت اور وفاداری برتی جسے وہ مرتے دم تک نہیں بھولا۔

مارتھے: لچا! شہدا چ بیوی بچوں کا چور! اتنی مصیبتیں اٹھائیں پھر بھی آوارگی نہ چھوڑی۔

شیطان: اسی لیے تو بیچارہ مر گیا۔ اب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ایک سال تک جی سے سوگ مناتا اور اس اثنا میں کوئی نیا چاہنے والا ڈھونڈ لیتا۔

مارتھے: اللہ جانتا ہے جیسا میرا پہلا تھا ویسا اب ساری دنیا میں ملنا دشوار ہے۔ ہائے ایسے پیارے اُلو کہاں ہوتے ہیں۔ بس اتنا عیب تھا کہ آوارہ گردی، پرائی جورو، پرائی شراب اور اس مٹ گئے جوئے پر جان دیتا تھا۔

شیطان: شاباش! اگر وہ بھی آپ کی حرکتوں سے اسی طرح چشم پوشی کرتا تو نبھ جاتی۔ یقین مانئے اس شرط پر تو میرا خود جی چاہتا ہے کہ آپ سے انگوٹھی[1] بدل لوں۔

مارتھے: آپ تو دل لگی کرتے ہیں۔

شیطان: (علیحدہ) بس اب یہاں سے کھسکنا چاہیے۔ یہ اگر شیطان کی بات پکڑ لے تو اسے بھی شادی کرتے ہی بن پڑے۔ (گریٹشن سے) کہئے اب آپ کے دل کا کیا حال ہے؟

مارگریٹے: میں آپ کی منشا نہیں سمجھی۔

شیطان: (علیحدہ) کیسی نیک، بھولی بھالی لڑکی ہے (دونوں سے مخاطب ہو کر) خدا حافظ! میں اجازت چاہتا ہوں۔

مارتھے: ایک بات اور بتاتے جائیے۔ کیا مجھے اس بات کا تصدیق نامہ مل سکتا ہے کہ میرا سرتاج کہاں، کب اور کیسے مرا اور دفن ہوا؟ میں ہمیشہ سے ضابطے کی پابندی کرتی ہوں۔ اس کے مرنے کی خبر سرکاری کاغذ میں چھپ جائے تو مجھے اطمینان ہو۔

شیطان: جی ہاں، بیگم صاحبہ۔ دو گواہوں کی شہادت ہر بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ میرا ایک ساتھی ہے بڑا بھلا مانس۔ میں اسے بھی عدالت میں پیش کر دوں گا۔ کہئے تو اسے آپ کے پاس لاؤں؟

مارتھے: ہاں ضرور لائیے۔ آپ کا بڑا احسان ہو گا۔

شیطان: اور یہ صاحبزادی بھی تشریف لائیں گی نہ؟ وہ بڑا اچھا لڑکا ہے، ملک ملک کی سیر کر چکا ہے اور نوجوان خاتونوں سے نہایت ادب اور شائستگی سے پیش آتا ہے۔

مارگریٹے: مجھے تو ان کے سامنے شرم آئے گی۔

---

1. یورپ میں قاعدہ ہے کہ جب لڑکے لڑکی میں نسبت ہو جاتی ہے تو وہ انگوٹھی بدل لیتے ہیں۔

شیطان: آپ کی سی شریف لڑکی بڑے سے بڑے بادشاہ سے آنکھ ملا سکتی ہے۔
مارتھے: تو ہم آپ آج شام کو اس مکان کے پچھواڑے باغ میں ان کا انتظار کریں گے۔

سڑک

فاؤسٹ......شیطان

فاؤسٹ: جلدی بتا! کچھ امید ہے؟ دیر تو نہیں لگے گی۔
شیطان: شاباش! کیوں نہ ہو! اب تک وہی گرما گرمی؟ بس تھوڑی دیر میں گریٹشن تمہاری ہے۔ آج شام کو وہ اپنی ہمسائی مارتھے کے یہاں تم سے ملے گی۔ یہ بڑھیا معلوم ہوتا ہے، خاص قحبہ پن اور کٹناپے کے لیے بنائی گئی ہے۔
فاؤسٹ: بس پھر تو کام بن گیا۔
شیطان: مگر اس کے بدلے میں ہمیں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔
فاؤسٹ: اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے۔
شیطان: بس ذرا سی حلفیہ شہادت دینا ہے کہ مارتھے کا شوہر پیڈوا میں قبر میں پیر پھیلائے سوتا ہے۔
فاؤسٹ: واہ رے تیری عقل مندی! اب اتنی دور کا سفر کرنا پڑے گا۔
شیطان: تیری سادگی کے قربان! ارے اس سے کیا واسطہ؟ شہادت دینا ہے یا تحقیقات کرنا ہے؟
فاؤسٹ: اگر اسی پر انحصار ہے تو بس ہو چکا۔
شیطان: اللہ رے تقدس! پھر ولی کیوں نہ بن گیا؟ کیا اپنی عمر میں پہلی بار جھوٹی شہادت دے رہا ہے؟ کیا تو نے بھویں چڑھا کر، سینہ ٹھونک کر بلند آہنگی سے دنیا اور مافیہا اور انسان اور اس کے دل و دماغ کی منطقی تعریفیں کبھی نہیں کیں؟ ذرا اپنے دل سے پوچھ اور ایمان سے کہہ کہ تجھے ان چیزوں کا اتنا بھی علم تھا جتنا ''شویرٹ لائن'' مرحوم کی موت کا؟
فاؤسٹ: تو بھی ہمیشہ جھوٹا اور سوفسطائی ہی رہا۔
شیطان: انسان ذرا گہری نظر ڈالے تو دل کا کھوٹ معلوم ہو جائے۔ بتا کل تو دنیا بھر کا

ایماندار بن کر بچاری گریٹشن کو نہیں پھسلائے گا اور اس پر قلبی محبت نہیں جتائے گا؟

فاؤسٹ: بیشک! سچے دل سے۔

شیطان: ہاں کیوں نہیں اور ابدی مہر و وفا کا پیمان، تن من قربان کرنے کا دعویٰ؟ یہ بھی سچے دل سے ہوگا؟

فاؤسٹ: بس بک بک نہ کر! یقیناً ہوگا! اگر میرے دل پر کوئی واردات گزرے میں اپنے احساس کی قیامت خیز کشمکش کے لیے کوئی نام ڈھونڈے نہ پاؤں اور سارے عالم محسوس و معقول کو چھان ڈالنے کے بعد اونچے سے اونچے اور گہرے سے گہرے لفظ تلاش کر کے لاؤں، اس التہاب قلب کو نامحدود ازلی ابدی کہوں تو کیا یہ شیطانی جھوٹ کا طلسم ہے؟

شیطان: میری بات میں ذرا برابر فرق نہیں۔

فاؤسٹ: خدا کے لیے سن اور سمجھ! میرے پھیپھڑے پر رحم کر! جو اپنی بات کی پچ کرنا چاہتا ہے اور منہ میں زبان رکھتا ہے اسے دنیا میں کوئی قائل نہیں کر سکتا۔ اس بک بک سے عاجز آ گیا! مجھے بغیر شہادت دیئے چارہ نہیں۔

باغ

(مارگریٹ، فاؤسٹ کے بازو کا سہارا لیے اور مارتھے، شیطان کے ساتھ ٹہل رہی ہے)

مارگریٹ: میں جانتی ہوں کہ آپ میری دل دہی کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے اس انکسار سے میں شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ سیاحوں کا دستور ہے کہ انہیں جو کچھ مل جائے فراخ دلی سے اس پر قناعت کرتے ہیں۔ آپ کے سے آدمی کو جس نے دنیا دیکھی ہے میری باتوں میں کیا خاک لطف آئے گا۔

فاؤسٹ: تیری ایک نظر میں، تیرے ایک لفظ میں جو بات ہے وہ ساری دنیا کی حکمت میں نہیں۔

(وہ اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

مارگریٹ: رہنے دیجئے آپ کو تکلیف ہوتی ہے! آپ میرا ہاتھ کیوں چومتے ہیں؟ کیسا بھدا اور کھردار ہے! گھر کا سارا کام مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اماں بڑی سختی کرتی ہیں۔

(دونوں آگے بڑھ جاتے ہیں)

مارتھے: تو آپ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں؟

شیطان؟ افسوس! اپنے پیشے اور اپنے فرائض کی بدولت ہم مارے مارے پھرتے ہیں! بعض جگہوں سے جاتے ہوئے جان پر بن جاتی ہے مگر ٹھہرنا اپنے اختیار میں نہیں!

مارتھے: جب تک جوانی دیوانی رہتی ہے آدمی کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر جھوکے کھانے میں خوش رہتا ہے مگر ایک دن بڑھاپے کی کٹھن گھڑیاں آن پہنچتی ہیں اور مرتے دم تک اکل کھرا بن بیاہا رہنے میں کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔

شیطان: اس کا تصور کر کے میں کانپتا ہوں۔

مارتھے: جناب عالی اسی لیے میں آپ سے کہتی ہوں کہ ابھی وقت ہے سوچ لیجیے۔

(آگے بڑھ جاتے ہیں)

مارگریٹے: سچ ہے آنکھ سے اوجھل دل سے دور! آپ کو میٹھی میٹھی باتیں کرنا آتا ہے: آپ کے نہ جانے کتنے دوست ہیں۔ میری سمجھ کا آپ کی سمجھ سے کیا مقابلہ۔

فاؤسٹ: پیاری خاتون یقین مان یہ جسے لوگ سمجھ کہتے ہیں اصل میں گھمنڈ اور چھچھوراپن ہے۔

مارگریٹے: یہ کیسے؟

فاؤسٹ: ہائے معصومی اور سادگی کو اپنی قدر بالکل نہیں ہوتی! عاجزی اور مسکینی محبت کرنے والی فیاض قدرت کی سب سے بڑی دین ہے۔

مارگریٹے: ہاں ہماری گرہستی چھوٹی سے ہے مگر پھر بھی اس کا سنبھالنا اچھا خاصا کام ہے۔ ہمارے گھر کوئی نوکرانی نہیں۔ مجھے خود پکانا ریندھنا' جھاڑو دینا' سینا پرونا اور صبح سے شام تک گھڑی گھڑی بازار جانا پڑتا ہے۔ پھر اماں ہر کام میں مین میکھ نکالتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمیں پیسے کی تکلیف نہیں۔ ہم چاہیں تو اوروں سے اچھی بسر ہو سکتی ہے۔ ابا جان اچھی خاصی جائیداد چھوڑ گئے ہیں۔ شہر کے قریب ایک مکان ہے اور ایک باغ۔ ہاں میں یہ کہتی تھی کہ آج کل گھر سنسان رہتا ہے۔ میرا بھائی فوج میں سپاہی ہے اور چھوٹی بہن گزر گئی۔ اس کے مارے میری ناک میں دم تھا مگر اسے اتنا چاہتی تھی کہ سب کچھ خوشی سے سہہ لیتی تھی۔

فاؤسٹ: اگر وہ تیری جیسی تھی تو حور ہوگی۔

مارگریٹ: میں نے ہی اسے پالا پوسا تھا اور وہ مجھے دل سے چاہتی تھی۔ وہ ابا کے مرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اماں ایسی بیمار تھیں کہ ہم سب ان کے بچنے سے ناامید تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اچھی ہو گئیں مگر اتنی کمزور تھیں کہ ننھی کو دودھ نہیں پلا سکتی تھیں۔ میں نے اسے دودھ اور پانی پر پالا۔ اس لیے وہ میری بچی ہو گئی۔ وہ میری گود میں ہنستی کھیلتی بڑی ہوئی۔

فاؤسٹ: تجھے کیسی بچی خوشی حاصل ہوتی ہوگی۔

مارگریٹ: مگر بعض گھڑیاں بڑی کٹھن گزریں۔ رات کو ننھی کا پالنا میرے پلنگ کے پاس رہتا تھا جہاں وہ ذرا بے چین ہوئی میری آنکھ کھل جاتی تھی اور جب وہ کسی طرح چپ نہیں ہوتی تھی تو میں اٹھ کر اسے سارے کمرے میں ٹہلاتی تھی۔ پھر صبح تڑکے اٹھ کر کپڑے دھونا' آگ جلانا' بازار سے سودا سلف لانا' غرض روز یہی قصہ رہتا تھا۔ اس میں کبھی کبھی آدمی کا جی چھوٹ جاتا ہے مگر یہ نہ ہو تو کھانے اور سونے کا مزا بھی نہیں۔

(آگے بڑھ جاتے ہیں)

مارتھے: بے چاری عورتوں کو بڑی مصیبت ہے۔ اکل کھرے بن بیاہے ایک نہیں سنتے۔

شیطان: آپ کی سی عورت ہو تو میری رائے پلٹ دے۔

مارتھے: اچھا صاف صاف کہیے آپ کو اب تک کوئی نہیں ملی؟ آپ کا دل کہیں نہیں اٹکا؟

شیطان: مثل ہے۔ اپنا چولہا' اچھی جورو سونے اور موتی سے بڑھ کر۔

مارتھے: میں کہتی ہوں آپ کا جی کبھی نہیں لہرایا۔

شیطان: میں جہاں جہاں گیا لوگ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔

مارتھے: اے دیکھو میں یہ پوچھتی تھی کہ آپ نے کہیں دل نہیں لگایا۔

شیطان: بھلا کس کا سر پھرا ہے کہ عورتوں سے دل لگی کرے۔

مارتھے: ہائے اللہ! آپ میری بات ہی نہیں سمجھتے۔

شیطان: مجھے سخت افسوس ہے مگر اتنا میں سمجھتا ہوں کہ میرے حال پر آپ کی بڑی مہربانی ہے۔

(آگے بڑھ جاتے ہیں)

فاؤسٹ: میری چھوٹی سی حور! جب میں باغ میں آیا تو' تو نے مجھے پہچان لیا تھا؟
مارگریٹ: آپ نے نہیں دیکھا میں نے شرم سے سر نہوڑا لیا تھا۔
فاؤسٹ: میں تجھ سے اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں کہ اس دن میں نے تجھے گرجے سے آتے وقت راہ میں ٹوکا تھا۔
مارگریٹ: میں گھبرا گئی تھی مجھے کبھی اس سے پہلے ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ میں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی کہ لوگ مجھے نام رکھیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس شخص نے میری چال ڈھال میں ضرور کوئی نامناسب بات' کوئی ڈھٹائی دیکھی اور مجھے ایسی ویسی عورت سمجھ کر بے دھڑک چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ سچ پوچھئے تو میرے دل میں آپ سے کچھ عجیب انس سا پیدا ہو گیا۔ مگر اپنے اوپر بڑا غصہ آتا تھا کہ آخر مجھے آپ پر غصہ کیوں نہیں آتا۔
فاؤسٹ: میری پیاری محبوبہ۔
مارگریٹ: ذرا ٹھہریئے تو! (ایک پھول توڑتی ہے اور اس کی پنکھڑیاں ایک ایک الگ کرتی ہے)
فاؤسٹ: یہ کیا؟ اس کا گلدستہ بنے گا؟
مارگریٹ: نہیں! یہ تو صرف ایک کھیل ہے۔
فاؤسٹ: کیا کھیل ہے؟
مارگریٹ: پھر آپ مجھ پر ہنسیے گا نہیں۔ (پنکھڑیاں الگ کرتی جاتی ہے اور چپکے چپکے کہتی جاتی ہے) وہ مجھے چاہتا ہے' وہ مجھے نہیں چاہتا۔
فاؤسٹ: ہائے کیا نور کی صورت ہے!
مارگریٹ: (بدستور) چاہتا ہے' نہیں چاہتا۔ چاہتا ہے' نہیں چاہتا۔ (آخری پنکھڑی الگ کرتی ہے اور چہرہ بھولے پن کی خوشی سے دمک اٹھتا ہے) وہ مجھے چاہتا ہے!
فاؤسٹ: ہاں میری پیاری! اس پھول کیفال کو دیوتاؤں کا قول سمجھ۔ ہاں وہ تجھے چاہتا ہے! تو اس کے معنی بھی سمجھتی ہے؟ وہ تجھے چاہتا ہے! (اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے)
مارگریٹ: میرا جی سنسناتا ہے!
فاؤسٹ: دل کو مضبوط کر اور ان ہاتھوں کے' ان آنکھوں کے' زبانی وہ پیام سن جسے الفاظ ادا

نہیں کر سکتے۔ یہ تسلیم و رضا کی لذت! یہ سچی خوشی جو ہمیشہ رہنے والی ہے! ہمیشہ ہمیشہ! یہ ختم ہوئی تو پھر یاس محض کا سامنا ہے۔ نہیں، یہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں! کبھی نہیں! (مارگریٹے اس کے ہاتھ کو دباتی ہے اور ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتی ہے۔ وہ ایک لمحے بھر خیالات میں ڈوبا کھڑا رہتا ہے پھر اس کا تعاقب کرتا ہے)

مارتھے: (شیطان کے ساتھ آتی ہے) رات ہو رہی ہے۔

شیطان: ہاں اب ہم جاتے ہیں۔

مارتھے: میں آپ کو ابھی اور ٹھہراتی مگر یہ محلہ بڑا خراب ہے۔ معلوم ہوتا ہے لوگوں کو سوائے اس کے کچھ کام ہی نہیں کہ ہمسایوں کی ٹوہ میں رہیں۔ آدمی چاہے جتنی احتیاط کرے ان لوگوں کی زبان سے نہیں بچ سکتا۔ وہ ہمارا عاشق معشوق کا جوڑا کہاں گیا؟

شیطان: ابھی اس روش پر دوڑتے ہوئے گئے ہیں۔ مرغان بہار کی طرح آزاد!

مارتھے: میں جانتی ہوں اس کا لڑکی پر دل آ گیا ہے۔

شیطان: اور لڑکی کا اس پر، یہی دنیا کا دستور ہے۔

باغ کا بنگلہ

(مارگریٹے جھپٹ کر اندر ہو رہتی ہے، دروازے کے پیچھے چھپ جاتی ہے اور ہونٹوں پر انگلی رکھے دراز میں سے جھانکتی ہے)

مارگریٹے: وہ آ رہا ہے۔

فاؤسٹ: (آتا ہے) اُف ری شوخی! کیوں صاحب ہمیں یوں ستاؤ گی؟ آخر ہم نے ڈھونڈھ لیا۔ (اس کا بوسہ لیتا ہے)

مارگریٹے: (اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بوسہ لیتی ہے)

میرے پیارے! میں تجھے دل سے چاہتی ہوں۔ (شیطان دروازے پر دستک دیتا ہے)

فاؤسٹ: (غصے سے زمین پر پیر پٹک کر) کون ہے؟

شیطان: سچا دوست

فاؤسٹ: جانور

شیطان: چلیے اب رخصت کا وقت ہے۔

مارتھے: (آتی ہے) ہاں صاحب اب دیر ہو گئی ہے۔

فاؤسٹ: مجھے اجازت ہے کہ آپ کے ساتھ گھر چلوں۔

مارگریٹے: امان مجھے۔ خدا حافظ!

فاؤسٹ: تو اب جانا ہی پڑے گا؟ خدا حافظ!

مارتھے: مع الخیر!

مارگریٹے: مع الخیر! اللہ جلدی ملائے۔

(فاؤسٹ اور شیطان چلے جاتے ہیں)

اللہ تیری شان کیسا عقلمند ہے! اس کے دماغ میں دنیا بھر کے خیالات ہوں گے۔ میں اس کے سامنے شرمائی ہوئی کھڑی تھی اور ہر بات پر "ہاں" کہتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری جیسی غریب مورکھ لڑکی میں اسے کیا بات پسند آئی؟

جنگل اور غار

فاؤسٹ: اے بلند و برتر روح، تو نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو میں نے مانگا تھا۔ میرا تجھے آتشیں شعلے کی شکل میں دیکھنا بےکار نہیں گیا۔ تو نے مجھے نگارخانہ فطرت کی بادشاہی بخشی، وہ نظر دی جو اس کے حسن پنہا کو دیکھتی ہے اور وہ دل جو اس کے مزے لیتا ہے۔ یہ تیرا ہی فیض ے کہ میں اسے حیرت کی سرد مہری سے نہیں دیکھتا بلکہ ایسی گرم جوشی سے جیسے کوئی اپنے دوست کے قلب کی گہرائیوں میں نظر ڈالتا ہے۔ تیری بدولت میں مظاہر فطرت کو جیتا جاگتا، چلتا پھرتا پاتا ہوں اور بے زبان جنگل، ہوا اور پانی کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور جب اس جنگل میں تند و پرشور طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ صنوبر کے بڑے بڑے درخت گر کر قریب کے چھوٹے درختوں کے تنوں اور شاخوں کو کچل دیتے ہیں اور ان کے گرنے کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر دھما دھم گونجتی ہے، تو تو مجھے کسی محفوظ غار میں چھپا دیتی ہے جہاں میں اپنی اندرونی دنیا کے مشاہدے میں محو ہو جاتا ہوں اور اپنے قلب کے گہرے پوشیدہ عجائبات کی سیر کرتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے پاک دامن چاند طوفان کی شورش کو فرو کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ اونچی چٹانوں اور بھیگے ہوئے درختوں میں مجھے گزرے ہوئے

زمانے کی روپہلی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اور مشاہدہ باطن کی اضطراب انگیز مسرت کو تسکین کے چھینٹے دیتی ہیں۔

مگر آہ اب مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ کوئی انسانی چیز مکمل نہیں ہوتی۔ اس سعادت کے ساتھ جو مجھے دیوتاؤں سے قریب تر کر رہی ہے تو نے مجھے ایسا ساتھی دیا ہے جسے چھوڑتے نہیں بنتا حالانکہ وہ سرد مہری بے باکی سے مجھے خود میری نظروں میں ذلیل کرتا ہے اور تیری دی ہوئی نعمتوں کو ایک لفظ میں ایک سانس میں معدوم کر دیتا ہے۔ اس نے خواہ مخواہ میرے دل میں اس حسین صورت کی محبت کی آگ بھڑکا دی ہے اور اب میں عجب کشمکش میں گرفتار ہوں۔ آرزو مجھے لذت کی طرف کھینچتی ہے اور لذت میں میرا دل آرزو کے لیے تڑپتا ہے۔

(شیطان آتا ہے)

شیطان: تم اب تک اس زندگی سے نہیں اکتائے؟ تمہارا اس میں اتنے دن جی کیسے لگا؟ آدمی ایک بار اس کا بھی تجربہ کرے مگر تھوڑے دن بعد کوئی اور تماشا ڈھونڈنا چاہیے۔

فاؤسٹ: تجھے سوائے اس کے کوئی اور کام نہیں کہ آن کر میرا مغز چاٹے؟

شیطان: واہ بھی واہ! میں کب تیری تنہائی میں مخل ہوا کرتا ہوں؟ تو شاید یہ مذاق میں کہہ رہا ہے۔ بھلا تیرے جیسے بے مروت چڑچڑے، خبطی ساتھی کی صحبت کا کسے شوق ہوگا؟ دن کو کام کرتے کرتے ناک میں دم آجاتا ہے اور پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ تجھے کون بات پسند آئے گی کون نہ آئے گی۔

فاؤسٹ: یہ نرالہ انداز ہے! ایک تو میرے کان کھاتا ہے اور اوپر سے شکریہ بھی چاہتا ہے۔

شیطان: اے زمین کے بے کس فرزند میرے بغیر تیری زندگی کا کیا حال ہوتا؟ میں نے تجھے پہروں تخیل کی خرافات سے محفوظ رکھا۔ میں نہ ہوتا تو' تو کرہ ارض سے کب کا کھسک گیا ہوتا۔ یہ تو اُلو کی طرح غاروں میں اور پہاڑیوں کے دروں میں کیا بیٹھا رہتا؟ مینڈک کی طرح کائی اور پتھروں کی رطوبت سے کیا پیٹ بھرنا ہے؟ واہ کیا اچھا شغل ہے؟ ابھی تک تیرا پروفیسر پنا نہیں گیا!

فاؤسٹ: تو کیا جانے مجھے ان ویرانوں کی سیر سے کیسی قوت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اگر تجھے اس کا اندازہ ہوتا تو اپنی شیطنت سے مجھے ہرگز اس حال میں نہ رہنے دیتا۔

شیطان: کیا کہنا اس مافوق الارض مسرت کا! رات کو اوس میں ان پہاڑوں پر لیٹنا اور

روحانی ذوق وشوق سے آسمان وزمین کا مشاہدہ کرنا' پھول کر دیوتا بن جانا' تخیل کے زور سے ناف زمین میں گھس جانا' اللہ میاں کے چھ دن کے سارے کام کو اپنے سینے میں سمیٹ لینا' غرور کی طاقت سے نہ جانے کیا کیا لطف اٹھانا' خوشی کے مرے ساری کائنات میں پھیل جانا' انسانیت کی قید سے رہا ہو جانا اور پھر سب سے بڑھ کر وجدان (اشارہ کر کے) اور آخر میں۔ کیا کہوں کہنے کی بات نہیں۔

فاؤسٹ: تف ہے تیرے گندے مذاق پر!

شیطان: ہاں ان باتوں کو آپ کیوں گوارا کرنے لگے' آپ کے سے پارسا کو تف کہنا ہی چاہیے جن باتوں کے بغیر پاکباز دلوں کا کام نہیں چلتا انہیں پاکباز کانوں کے سامنے کہنا منع ہے۔ خیر کبھی کبھی یہ بھی سہی۔ میری طرف سے تو شوق سے جھوٹے خیالوں سے اپنا دل بہلا۔ مگر کب تک؟ تو اس کھیل سے کب کا گھبرا گیا ہے مگر خبط کے سبب سے یا ڈر کے مارے اب تک اڑا ہوا ہے۔ اچھا اب یہ قصہ ہو چکا۔ تیری معشوقہ اپنے گھر بیٹھی کڑھتی اور تڑپتی ہے۔ تیری یاد اس کے دل سے کسی طرح نہیں جاتی' تیرے پیچھے دیوانی ہے۔ پہلے تو تیرے دل میں محبت کا ایسا جوش اٹھا جیسے پگھلی ہوئی برف کا سیلاب آتا ہے اور اس بیچاری کو شرابور کر گیا اور اب تیری ندی اتر گئی۔ میری ناقص رائے میں جناب والا اگر بجائے جنگلوں کو رونق بخشنے کے اس غریب بندریا کو اس کی محبت کا انعام دیتے تو زیادہ مناسب تھا۔ بیچاری سے وقت کاٹے نہیں کٹتا! پہروں کھڑکی کے پاس کھڑی بادلوں کو پرانی شہر پناہ سے گزرتے دیکھا کرتی ہے۔ ''اگر میں چڑیا ہوتی'' یہ گیت وہ دن بھر اور آدھی آدھی رات تک گایا کرتی ہے۔ کبھی کبھی وہ چاق ہوتی ہے مگر اکثر سست' کبھی جی بھر کے روتی ہے تو ذرا دل ٹھہر جاتا ہے مگر محبت کی لگن سے دم بھر خالی نہیں۔

فاؤسٹ: ارے تو سانپ ہے۔

شیطان: (علیحدہ) اب کہاں جاتا ہے بچ کے۔

فاؤسٹ: جا یہاں سے مردود اس حسین لڑکی کا نام نہ لے۔ میرا دل یونہی آدھا سودائی ہو رہا ہے اس پیارے جسم کی خواہش کو پھر نہ ابھار۔

شیطان: آخر یہ ہے کیا! وہ سمجھتی ہے کہ تو اسے چھوڑ کر بھاگ گیا اور تیرا رنگ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

فاؤسٹ: میں چاہے کتنی دور رہوں مگر اس سے قریب ہوں۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی نہیں چھوڑ سکتا' مجھے اس خیال سے رشک آتا ہے کہ کہیں اس عرصے میں اس کے لبوں نے عشائے ربانی کو نہ چوما ہو۔

شیطان: واہ میرے دوست! اور مجھے اکثر تمہارے لبوں پر رشک آتا ہے جو گلاب کی پنکھڑیاں چوستے ہیں۔

فاؤسٹ: دور ہو قوم ساق!

شیطان: شاباش خوب کہی! مجھے تمہاری گالیوں پر ہنسی آتی ہے جس خدا نے لڑکوں اور لڑکیوں کو پیدا کیا اس نے انہیں ملانے کا مبارک کام بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ آؤ بس چلو بڑی شرم کی بات ہے اپنی معشوقہ کی خواب گاہ میں جارہے ہو یا موت کے منہ میں۔

فاؤسٹ: آہ اس کی آغوش میں کیسی آسمانی مسرت ہے؟ چل اس کو سینے سے لگا کر زندگی کا لطف حاصل کروں۔ کیا میرے دل میں ہمیشہ اس کی تمنا نہیں رہتی؟ کیا میں مفرور' خانہ بندوش نہیں ہوں؟ وہ ننگِ انسانیت جو بے مقصد بے چین آبشار کی طرح چٹانوں میں ٹھوکریں کھاتا' غصہ اور آرزو میں بھرا بلندی سے کھڈ میں گرتا ہے اور میری معشوقہ اس سیلاب سے الگ کوہ آلپس کے دامن میں اپنی جھونپڑی میں بیٹھی اپنے دھندلے طفلانہ جذبات میں محو ہے۔ اپنی چھوٹی سی دنیا پر قناعت کیے خانہ داری کے ابجد دہرا رہی ہے مگر مجھ پر خدا کی مار! میں نے چٹانوں کو پکڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے پر بس نہیں کی بلکہ اس معصوم لڑکی کے دل کے چین کو بھی غارت کر دیا! اے جہنم کی آگ میں نے اسے بھی تجھ پر بھینٹ چڑھا دیا! اے "شیطان" اس خوف کے زمانے کو مختصر کرنے میں میری مدد کر۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ ابھی ہو جائے! اس کی قسمت میری قسمت سے ٹکرائے اور ہم دونوں برباد ہو جائیں۔

شیطان: پھر وہی جوش و خروش! پھر وہی التہاب! ارے احمق جا اور اسے تسکین دے۔ تیرے جیسے چھوٹی کھوپڑی والے کو جب کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تو جھٹ سے موت کا تصور لے بیٹھتا

ہے۔ سلامت رہیں وہ جو زندگی کے مرد میدان ہیں! یوں تو' تو اچھا خاصا شیطان ہے مگر جو شیطان ہمت ہار بیٹھے اس سے زیادہ بد مذاق دنیا میں کوئی نہیں۔

گریٹشن کی خواب گاہ

(گریٹشن اکیلی بیٹھی چرخا کات رہی ہے)

میرے جی کا چین جاتا رہا،
میرا دل بھاری بھاری ہے،
ہائے اب وہ دن کبھی نہ لوٹیں گے،
کبھی نہیں، کبھی نہیں،
جہاں وہ میرا پیارا نہ ہو
وہ جگہ قبر سے بدتر ہے۔
بے اُس کے ساری دنیا مجھے
زہر معلوم ہوتی ہے
میرا دکھیا سر،
جنون کا گھر بن گیا،
میرے غریب حواس
چھوٹ کر، ٹوٹ کر، بکھر گئے۔
میرے جی کا چین جاتا رہا
میرا دل بھاری بھری ہے۔
میں اس کی راہ دیکھنے کو،
کھڑکی سے جھانکا کرتی ہوں،

اسی کی تلاش میں،
گھر سے نکل کر پھرتی ہوں۔
وہ اس کی شاہانہ چال،
وہ اس کا اونچا اونچا قد،
وہ اس کی پیاری مسکراہٹ،
وہ اس کی آنکھوں کی کشش،
وہ اس کی میٹھی میٹھی باتیں،
جیسے جادو کا دریا بہتا ہو۔
وہ اس کا ہاتھ دبا دینا
اور ہائے وہ اس کا بوسہ!
میرے جی کا چین جاتا رہا
میرا دل بھاری بھاری
میرا دل آپ ہی آپ
اس کی طرف کھنچتا ہے۔
کاش میں اس کو پاؤں
اور اپنا کر کے رکھوں؛
اس کو اتنا پیار کروں
جتنی جی کو خواش ہے؛
وہ میرے بوسے لیتا ہو
اور میں دنیا سے گزر جاؤں۔

مارتھا کا باغ

مارگریٹ......فاؤسٹ

مارگریٹ: ہائنرش، مجھے قول دے۔

فاؤسٹ: دل و جان سے۔

مارگریٹ: اچھا یہ تو بتا تیرا مذہب کے معاملے کیا حال ہے؟ تو دل کا بڑا اچھا ہے مگر میں سمجھتی ہوں تجھے دین پر اعتقاد نہیں۔

فاؤسٹ: میری جان ان باتوں کو جانے دے! تو جانتی ہے کہ میں تجھے پیار کرتا ہوں۔ اپنے پیاروں کے لیے میں جان دینے کو، خون بہانے کو تیار ہوں اور کسی سے اس کا عقیدہ اس کا کلیسا چھیننا نہیں چاہتا۔

مارگریٹ: یہ تو ٹھیک نہیں، آدمی کو خود بھی عقیدہ ہونا چاہیے۔

فاؤسٹ: سچ مچ؟

مارگریٹ: کاش میں تیرا دل پھیر سکتی! تو عشائے ربانی کا بھی ادب نہیں کرتا؟

فاؤسٹ: دل سے ادب کرتا ہوں۔

مارگریٹ: مگر بے آرزو کے۔ نماز کے لیے اور اعتراف گناہ کے لیے تو مدتوں سے نہیں گیا؟ تو خدا کو مانتا ہے؟

فاؤسٹ: میری پیاری کون یہ کہہ سکتا ہے "میں خدا کو مانتا ہوں۔" پادری یا فلسفی سے پوچھو تو اس کا جواب سوال کا مضحکہ سا معلوم ہوتا ہے۔

مارگریٹ: پھر تو نہیں مانتا؟

فاؤسٹ: اے حسین صورت والی میری بات کا مطلب غلط نہ سمجھ۔ کس میں یہ تاب ہے کہ خدا کا نام لے اور اس پر ایمان نہ لائے۔ تو پوچھتی ہے کہ میں اسے مانتا ہوں یا نہیں؟ کس احساس رکھنے والے دل کی مجال ہے کہ کہے "میں اسے نہیں مانتا! وہ محیط کل! وہ قادر مطلق! کیا اس کی قدرت اور اس کی ذات مجھے، تجھے اور خود اسے محیط نہیں؟ کیا اوپر آسمان گنبد نہیں؟ کیا نیچے زمین کا فرش نہیں؟ کیا ابدی ستارے محبت کی نظریں برساتے سیر میں مصروف نہیں؟ کیا میں تجھے

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہیں دیکھ رہا ہوں؟ کیا تیرے دل ودماغ میں وجود مجھ بسا ہوا نہیں؟ کیا تیری آنکھوں میں راز آشکارا چھایا ہوا نہیں؟ اس وسعت نامحدود سے اپنے دل کو معمور کر لے اور جب اس واردات سے تجھ پر وجد طاری ہو جائے تو اس کا جو نام چاہے رکھ لے۔ سعادت‘ دل‘ عشق یا خدا میرے پاس اس کے لیے کوئی نام نہیں۔ جو کچھ ہے وجدان ہے۔ نام ایک آواز ہے‘ ایک دھواں جو کہر بن کر آسمانی نور کو چھپا لیتا ہے۔

مارگریٹے: یہ تو اچھی اچھی باتیں ہیں۔ پادری صاحب بھی کچھ ایسا ہی کہتے ہیں مگر ذرا اور لفظوں میں۔

فاؤسٹ: آسمان کے نیچے سارے سنسار میں‘ سارے دل‘ یہی کہتے ہیں مگر اپنی اپنی زبان میں۔ پھر میں اپنی زبان میں کیوں نہ کہوں؟

مارگریٹے: اس طرح سننے میں تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے مگر کچھ کسر ضرور ہے کیونکہ تجھ میں عیسائیوں کی باتیں نہیں۔

فاؤسٹ: میری پیاری معصوم گریٹشن!

مارگریٹے: میں کتنے دن سے کڑھتی ہوں کہ تیری صحبت اچھی نہیں۔

فاؤسٹ: وہ کیسے؟

مارگریٹے: جو شخص تیرے ساتھ رہتا ہے اس سے مجھے قلبی نفرت ہے۔ کبھی عمر بھر میرے دل میں ایسی بے چینی اور خلش نہیں ہوئی جیسی اس کی نامراد شکل دیکھ کر ہوتی ہے۔

فاؤسٹ: میری پیاری گڑیا اس سے مت ڈر۔

مارگریٹے: جب وہ ہوتا ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ ویسے میں سب لوگوں سے اچھی طرح پیش آتی ہوں لیکن جب کبھی تجھے دیکھنے کو دل چاہتا ہے تو اس شخص کے خیال سے عجب کچھ دہشت اور نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔ میں تو اسے بڑا موذی سمجھتی ہوں۔ یا اللہ! اگر میں اسے خواہ مخواہ برا کہتی ہوں تو مجھے معاف کر۔

فاؤسٹ: ایسوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مارگریٹے: خدا مجھے ان کی صحبت سے پناہ میں رکھے۔ جیسے ہی وہ دروازے میں قدم رکھتا ہے‘ حقارت کی ہنسی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا ہے اور کچھ بیزار سا نظر آتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ

اسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ اس کے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ کوئی اللہ کا بندوا سے نہیں بھاتا۔ تجھ سے گلے مل کر میری روح خوش ہوتی ہے، جی کھلا کھلا رہتا ہے اور جوش اٹھتا ہے کہ اپنی جان تجھے سونپ دوں مگر جب وہ ہوتا ہے تو دل بند سا ہو جاتا ہے۔

فاؤسٹ: میری فرشتہ صفت حقیقت شناس محبوبہ!

مارگریٹے: میں ایسی بے قابو ہو جاتی ہوں کہ جہاں وہ ہم دونوں کے پاس آیا، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے تیری محبت نہیں رہی۔ اس کے ہوتے مجھ سے دعا بھی نہیں مانگی جاتی۔ اس سے میرے دل میں ناسور سا پڑ گیا ہے۔ تیرا بھی ہائنرش یہی حال ہوگا؟

فاؤسٹ: تجھے تو اس سے للہی بغض ہے۔

مارگریٹے: اب مجھے جانا چاہیے۔

فاؤسٹ: آہ! کیا کبھی یہ موقع نصیب نہ ہوگا کہ تجھے آغوش میں لے کر گھڑی بھر جسمانی اور روحانی وصل کا لطف اٹھاؤں۔

مارگریٹے: کاش میں گھر میں اکیلی سوتی! آج رات کو میں خوشی سے کواڑے کھلے رہنے دیتی مگر اماں کی نیند بڑی ہلکی ہے، اگر وہ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ لیں تو میری تو وہیں جان نکل جائے۔

فاؤسٹ: میری پیاری یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ میں تجھے یہ شیشی دیتا ہوں، اس کے تین قطرے پانی میں ملا کر انہیں پلا دے تو وہ غافل سو جائیں گی۔

مارگریٹے: مجھے تیری خاطر سب قبول ہے مگر اس سے انہیں کوئی نقصان تو نہ ہوگا؟

فاؤسٹ: بھلا ایسی بات ہوتی تو تجھے یہ صلاح دیتا؟

مارگریٹے: میرے پیارے تجھے دیکھتے ہی نہ جانے کیا چیز مجھے تیری مرضی کے تابع کر دیتی ہے۔ میں تیرے لیے سبھی کچھ کر چکی اب کیا رہا ہے، جس کا ڈر ہو۔

(چلی جاتی ہے)

(شیطان آتا ہے)

شیطان: گئی وہ بے وقوف چھوکری؟

فاؤسٹ: تو پھر جاسوسی کر رہا تھا؟

شیطان: میں نے ایک ایک لفظ صاف سنا۔ حضرت علامہ سے منکر نکیر کی طرح سوال و

جواب کیسے جا رہے تھے۔ امید ہے کہ یہ گفتگو کو فائدہ پہنچائے گی۔ لڑکیوں کو اس کی بڑی فکر رہتی ہے کہ فلاں شخص پرانے طریقے کا سیدھا سادہ دیندار ہے یا نہیں۔ جانتی ہیں نہ کہ اگر یہاں پانی مرتا ہے تو ہمارا بھی کلمہ پڑے گا۔

فاؤسٹ: اے عجیب الخلقت جانور تجھے کیا خبر کہ یہ پیاری بچی دیندار لڑکی جس کی سعادت کا سارا سرمایہ اس کا عقیدہ ہے' اپنے پیارے کو گمراہ سمجھ کر کیسے روحانی کرب میں ہے؟

شیطان: واہ رے پاکباز بوالہوس ایک ذرا سی لڑکی تجھے انگلیوں پر نچاتی ہے۔

فاؤسٹ: خاموش اے آگ اور کیچڑ کی بے ادب اولاد!

شیطان: اور ماشاء اللہ قیافہ شناسی میں بھی پوری استاد ہے! جب میں ہوتا ہوں تو بے چاری کا نہ جانے کیا حال ہوتا ہے۔ میرے بہروپ کا بھید پا گئی' اسے محسوس ہو گیا کہ میں کوئی خبیث روح ہوں بلکہ شیطان ہی سمجھا ہو تو عجب نہیں مگر آج رات کو۔

فاؤسٹ: تجھ سے کیا واسطہ' ملعون؟

شیطان: واہ' یہی تو میری خوشی کی بات ہے!

فوارے کے قریب

(گریٹشن اور لیشن گھڑے لیے ہوئے)

لیشن: تو نے باربرا کا حال سنا؟

گریٹشن: میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں کسی سے ملتی ملاتی نہیں۔

لیشن: واہ' آج زیبل کہتی تھی کہ وہ بھی آخر پھندے میں پھنس گئی۔ بڑی شریف زادی بنتی تھی!

گریٹشن: کیوں کیا ہوا؟

لیشن: بڑی گندی بات ہے' اب وہ جو کھاتی پیتی ہے وہ اس کے سوا پیٹ میں ایک اور کے انگ لگتا ہے۔

گریٹشن: ہائے اللہ!

لیشن: اچھا ہوا! وہ اسی قابل تھی۔ کب سے اس مردوے کے پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ جب

دیکھو تب ساتھ ٹہلنا' گاؤں میں' ناچ کے جلسے میں سب سے آگے آگے رہنا۔ وہ اسے سنبو سے کھلا کر' شراب پلا کر پھسلاتا تھا۔ اپنی صورت پر اتنا ناز اور اس پر یہ بے غیرتی کہ اس سے تحفے لیتی تھی۔ وہ چوما چاٹی وہ گدگدیاں! آخر موتی کی سی آب اتر گئی نہ!

گریٹشن: ہائے بے چاری غریب لڑکی!

لیشن: لو اور سنو' تجھے اس پر ترس آتا ہے! ہم جیسی لڑکیاں بیٹھ کر چرخہ کاتتی تھیں' ماں ہمیں گھر سے نکلنے نہ دیتی تھی اور وہ مزے میں اپنے پیارے عاشق کے ساتھ پھرتی تھی' دروازے کی بینچ پر بیٹھے یا اندھیری گلی میں کھڑے پہروں گزر جاتے تھے اور ان دونوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ اب بیگم چپ چاپ سر جھکا دیں اور گنہگاروں کے کپڑے پہن کر گرجا کی کال کوٹھری میں اپنے کیے کی سزا بھگتیں۔

گریٹشن: وہ اس سے ضرور شادی کرے گا۔

لیشن: کہیں کی نہ ہو! وہ ایسا بے وقوف نہیں۔ اس کے سے بانکے جوان کو ایک سے ایک بڑھ کر مل سکتی ہے اور وہ تو چل بھی دیا۔

گریٹشن: بڑا برا کیا۔

لیشن: اگر وہ اس سے شادی کرے تو بیوی بنو کی کمبختی آ جائے' لڑکے اس کے سہرے کو نوچ کر پھینک دیں اور ہم لوگ اس کے دروازے پر بھوسی اڑائیں۔

(چلی جاتی ہے)

گریٹشن: (گھر جاتے ہوئے) پہلے جب کوئی غریب لڑکی ایسا گناہ کرتی تھی تو میں کس بری طرح اس کی خبر لیتی تھی! دوسروں کے گناہوں پر لعن طعن کرنے کے لیے کڑی سے کڑی بات بھی نرم معلوم ہوتی تھی۔ میں ان کی کالک میں اور کالک لگاتی تھی۔ کبھی جی نہ بھرتا تھا اپنی تعریف آپ کرتی تھی اور غرور سے پھول جاتی تھی اور اب دیکھتی ہوں تو خود گناہ میں سنی ہوئی ہوں! مگر ہائے جن باتوں نے یہ دن دکھایا وہ کیسی اچھی تھیں کیسی پیاری تھیں!

احاطہ

(ایک طاق میں حسرت و الم کی ملکہ' کنواری مریم کا مجسمہ ہے' اس کے سامنے گل دان

رکھے ہیں)

گریٹشن: (گلدانوں میں تازے پھول رکھتی ہے)

ایک شفقت کی نظر،
اے درد بھری دکھیاری بی بی،
اس آفت کی ماری پر
دل میں برچھی لیے ہوئے،
ہزار دکھ پیئے ہوئے،
تو اپنے بیٹے کی موت کو دیکھ رہی ہے
تو آسمانی باپ کو تکتی ہے،
اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہے
اپنی اور اس کی مصیبت پر
کسے یہ خبر کہ میری رگ رگ میں
کیسا درد دلہکتا ہے؟
میرا یہ دکھیا دل
ڈر سے کیسا کانپتا ہے!
کس آرزو میں تڑپتا ہے
تیرے سوا یہ کون جانے!
جہاں کہیں میں جاتی ہوں۔
میرا دل اس جگہ پر
کیسا کیسا دکھتا ہے
جب میں اکیلی ہوتی ہوں
کلیجہ شق ہو جاتا ہے
کیسا کیسا روتی ہوں!
ہائے! آج صبح تڑکے

جب میں اپنی کھڑکی کے آگے
تیرے لیے پھول توڑ رہی تھی،
میرے آنسوؤں سے گملوں پر اوس پڑ گئی۔
صبح جب سورج کی کرنیں
میرے کمرے میں چمکیں،
میں نہ جانے کب سے بستر میں بیٹھی
اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی
مجھے ذلت اور موت سے بچا!
ایک شفقت کی نظر
اے درد بھری دکھیاری بی بی
اس آفت کی مار پر۔

رات

گریٹشن کے مکان کے سامنے والی سڑک
(والنٹین سپاہی، گریٹشن کا بھائی)

جب اس دن پڑاؤ میں میرے ساتھی اپنی اپنی چہیتی لڑکیوں کی تعریف کر رہے تھے اور گلاس بھر بھر کران کا جام صحت پی رہے تھے یہاں تک کہ شراب بہہ کران کی کہنیوں تک پہنچتی تھی، تو میں اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا ان کی ڈینگیں سن رہا تھا اور مسکرا کر داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آخر میں نے گلاس بھر کر اٹھایا اور کہا "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" مگر انصاف سے کہو سارے دیس میں کوئی لڑکی میری پیاری بہن گریٹشن کے پاسنگ بھی ہے؟ یہ کہنا تھا کہ یہاں سے وہاں تک گلاسوں کی جھنکار اور واہ وا کی آواز گونج گئی۔ بعضوں نے کہا سچ کہتا ہے وہ ساری عورتوں کی سرتاج ہے۔ جتنے شیخی خورے تھے دم بخود رہ گئے اور اب؟ ہائے جی چاہتا ہے اپنے بال نوچوں اور دیوار سے سر ٹکراؤں! ہر بدمعاش مجھ پر فقرے کسے گا اور انگلیاں اٹھائے گا! میں مجرم کی طرح سر جھکائے رہوں گا اور جہاں کسی کی زبان سے دھوکے میں بھی کوئی لفظ نکلا میں پسینے پسینے ہو جاؤں گا اور چاہے میں ان کی

بوٹیاں بھی اڑا دوں مگر یہ کس منہ سے کہوں گا کہ تم جھوٹے ہو۔ یہ کون چپکے چپکے آ رہا ہے؟ دو آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہی نکلا تو میں ابھی اس کی گردن پکڑتا ہوں اور یہاں سے جیتا نہ جانے دوں گا۔

فاؤسٹ......شیطان

فاؤسٹ: دیکھ وہ گرجا کے تبرکات کے کمرے سے ابدی چراغ کی روشنی آ رہی ہے جس کا چھوٹا سا حلقہ کناروں پر دھیما ہو جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف کس قیامت کا اندھیرا ہے! ایسی ہی تاریکی میرے دل میں چھائی ہوئی ہے۔

شیطان: اور میرا یہ حال ہے جیسے ایک سوکھی سی بلی دبے پاؤں آگ بجھانے کی سیڑھی پر چڑھ جائے اور پھر چپکے چپکے دیواروں پر چلے۔ میں اس وقت نیکی کے دم میں ہوں کچھ تو چوری کا شوق ہے کچھ لڑائی جھگڑے کا معلوم ہوتا ہے کہ ''والپرگس'' کی شاندار رات کی خوشی ابھی سے خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ بس کل کا دن بیچ میں ہے پرسوں رت جگے کا مزا آئے گا۔

فاؤسٹ: معلوم ہوتا ہے کلیسا کے تبرکات کا خزانہ کچھ اونچا سا ہو گیا ہے۔ وہ سامنے چمک رہا ہے۔

شیطان: ذرا صبر کرو پھر ہم پورے ظرف کو ہتیا لیں گے۔ کچھ دن ہوئے میں نے جھانک کر دیکھا تھا اس میں بڑی چمکدار اشرفیاں ہیں۔

فاؤسٹ: کوئی زیور، کوئی انگوٹھی وغیرہ نہیں جو میں اپنی معشوقہ کو پہناؤں؟

شیطان: مجھے کچھ اس طرح کی چیز نظر آئی تھی جیسے موتیوں کی مالا ہو۔

فاؤسٹ: بس تو پھر ٹھیک ہے! اس کے یہاں خالی ہاتھ جانے سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

شیطان: واہ اگر کبھی کبھی مفت میں کام بن جائے تو اس میں کوفت کی کون سی بات ہے۔ اس وقت تاروں بھرے آسمان کا منظر کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں تمہیں اپنا موسیقی کا کمال دکھاتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہاری معشوقہ کے سنانے کو ایک اخلاقی گیت گاتا ہوں جس میں وہ اور بھی بے وقوف بن جائے۔

(ستار کے ساتھ گاتا ہے)

اری کیتھرین،
تو صبح تڑکے
عاشق کے دروازے
کیسی کھڑی ہے؟
کیوں گھبراتی ہے
وہ تجھے بلائے گا
بھلا ایک لڑکی کو
کیسے پھیر دے گا؟
دیکھو خبردار
جب ملاقات ہو چکے!
تو رخصت ہو جاؤ
غریب لڑکیو!
اگر عزت پیاری ہے
تو بے شادی کی انگوٹھی کے
کبھی چوری سے آنکھ نہ لڑاؤ۔

والنٹین: (سامنے آتا ہے) کیوں بے ملعون چوہے مار' یہ تو گا کر کسے رجھاتا ہے؟ پہلے میں اس باجے کو جہنم بھیجتا ہوں اور پھر بجانے والے کو۔

شیطان: لو باجا ٹوٹ گیا' اس کا تو فیصلہ ہوا!

والنٹین: اب تیرا سر ٹوٹے گا!

شیطان: (فاؤسٹ سے) حضرت علامہ' قدم نہ ہٹے! ہمت بندھی رہے! میرے پاس رہیے جو میں کہوں وہ کیجئے۔ اپنی تلوار نکالیے اور بڑھ کر ہاتھ لگائیے! میں بچاتا ہوں!

والنٹین: لے بچا یہ چوٹ!

شیطان: بہ سر و چشم!

والنٹین: اور یہ!

شیطان: بہت بہتر!

والنٹین: ارے یہ تو شیطان کی لڑائی لڑتا ہے! ہائیں یہ کیا؟ میرا ہاتھ شل ہو گیا۔

شیطان: آگے بڑھ کر ایک ہاتھ!

والنٹین: (گرتا ہے) ہائے!

شیطان: اب ٹھیک ہو گئے بچہ! مگر اب چلو یہاں سے کھسک جائیں' سنو' کیسی چیخم دھاڑ مچی ہے۔ پولیس والوں سے تو معاملہ کرلوں مگر عدالت میرے بس کی نہیں۔

مارتھے: (کھڑکی کے پاس) دوڑو لوگو دوڑو!

گریٹشن: (کھڑکی کے پاس) ارے کوئی روشنی لاؤ!

مارتھے: گالی گلوج اور تلوار چلنے کی آواز آ رہی ہے۔

لوگ: ارے یہ تو کوئی مرا پڑا ہے۔!

مارتھے: (باہر نکل کر) قاتل کیا بھاگ گئے؟

گریٹشن: (باہر نکل کر) ارے یہ کون پڑا ہے؟

لوگ: تیرا بھائی۔

گریٹشن: ہائے یہ کیا غضب ہوا!

والنٹین: میں مرتا ہوں! کہنے میں اتنی سی دیر لگتی ہے اور کرنے میں اس سے بھی کم۔ اے عورتو تم کیوں واویلا مچائے ہو؟ ادھر آؤ' میری بات سنو۔ (سب اس کے آس پاس کھڑی ہو جاتی ہیں) دیکھ میری پیاری گریٹشن تو ابھی بچہ ہے' ابھی تجھے ذرا سلیقہ نہیں۔ تو اپنا کام بڑی بری طرح کرتی ہے میں تجھ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں تو آبرو باختہ تو ہو ہی گئی' اب کھلم کھلا پیشہ کیوں نہیں کرتی؟

گریٹشن: ہائے میرا بھائی! ہائے اللہ یہ کیا کہتا ہے؟

والنٹین: اللہ میاں کو بیچ میں مت لا۔ افسوس! جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور جو باقی ہے وہ اب ہوگا۔ تو نے چھپ کر ایک سے یارانہ کیا ہے' کچھ دن میں اوروں تک نوبت پہنچے گی اور جہاں دس بارہ وہاں سارا شہر سہی۔ جب بدکاری پیدا ہوتی ہے تو وہ پہلے پہل چھپائی جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر

اندھیری رات کی نقاب ڈالی جاتی ہے بلکہ آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دے مگر جب وہ پل کر بڑی ہو جاتی ہے تو دن دوپہر ننگی پھرتی ہے حالانکہ وہ جیسی بدشکل تھی ویسی ہی رہتی ہے۔ جوں جوں اس کی صورت بگڑتی جاتی ہے اسے باہر نکلنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے جب اے قحبہ سارے بھلے آدمی تجھ سے یوں دور دور رہیں گے جیسے کسی وبائی لاش سے۔ تو جب ان سے آنکھ ملائے گی تو تیرا دل سینے میں سہم کر رہ جائے گا۔ نہ تجھے سونے کا ہار پہننا نصیب ہوگا اور نہ گرجے کی قربان گاہ میں کھڑا ہونا۔ تجھ سے اجلے کپڑے پہن کر شریک نہ ہوتے بنے گا۔ تو کسی اندھیرے غم کدے میں فقیروں اور اپاہجوں کے ساتھ پڑی رہے گی اور اگر خدا نے تیرا گناہ معاف بھی کر دیا تو دنیا تجھ پر تھوکتی ہی رہے گی۔

مارتھے:

اب اپنی روح اللہ کی رحمت کو سونپو! کیوں مرتے وقت کسی کو برا بھلا کہہ کر اپنے سر اور بوجھ لیتے ہو؟

والنٹین: اے بے شرم کٹنی اگر میں تیری سوکھی ہڈیوں کو کچل سکتا تو مجھے امید ہوتی کہ میرے سارے گناہوں کی اچھی طرح تلافی ہو جائے گی۔

مارگریٹے: ہائے میرا بھائی! ہائے یہ دوزخ کا عذاب!

والنٹین: کہہ دیا تجھ سے یہ ٹسوے بہانا چھوڑ دے! تو اپنی آبرو کھو چکی اور میرے دل پر کاری ضرب لگا چکی۔ اب میں موت کی نیند سو کر ایک بہادر سپاہی کی طرح خدا کے پاس جاتا ہوں۔

(مر جاتا ہے)

گرجا

نماز' گرجا کا ارگن باجا' گانا

(گریٹشن لوگوں کے مجمع میں' خبیث روح گریٹشن کے پیچھے)

خبیث روح

گریٹشن تیری کچھ اور ہی شان تھی

جب تک تو معصوم تھی،
اور چھوٹی سی بوسیدہ کتاب سے
تتلا کر دعائیں پڑھتی تھی،
ادھا بچوں کا کھیل
اور آدھا خدا کا دھیان۔
گریٹشن!
اب تیرا خیال کدھر ہے؟
اور تیرے دل پر یہ گناہ کا بوجھ کیسا ہے؟
کیا تو اپنی ماں کے لیے دعا مانگتی ہے
جو تیرے ہاتھ سے ایڑیاں رگڑ کر مری؟
تیری دہلیز پر یہ کس کا خون ہے؟
کیا تیرے دل میں ایک ہیجان سا نہیں اٹھتا
جو خود ڈرتا ہے اور تجھے ڈراتا ہے
اپنی پراسرار موجودگی سے؟

گریٹشن

اُف! اُف!
کاش میں ان خیالات سے نجات پاؤں،
جو میرے دل میں آتے جاتے ہیں
روکنے سے نہیں رکتے!

کورس

وہ یوم جلال وہ قیامت کا دن
جس کی گرمی سے زمین پگھل جائے گی۔

خبیث روح

تو جلی مرتی ہے!
صور پھنک رہا!
قبریں لرز رہی ہیں!
اور تیرا دل
راکھ کے سکوں سے
کروٹ بدل کر
آتش سوزاں میں بھن رہا ہے۔

گرٹیشن

کاش میں یہاں نہ ہوتی!
اس ارگن کی آواز سے
میرا دل گھبراتا ہے،
اور یہ گیت میرے دل کو
اندر سے مسلتے ہیں۔

کورس

آہ! اب داور محشر کے آگے
سارے بھید کھل جائیں گے؛
ایک ایک گناہ کی سزا ملے گی۔

گریٹشن

جی او بھا سا جاتا ہے!
ان دیواروں اور کھمبوں سے

کیسی وحشت ہوتی ہے!

یہ بھاری چھت

سینے پر بوجھ ڈالتی ہے!

ہائے اک ذرا سی ہوا!

خبیث روح

تو لاکھ چھپ مگر بدکاری

کہیں چھپائے چھپتی ہے۔

کیسی ہوا؟ کیسی روشنی؟

وائے، ہو تجھ پر!

کورس

ہائے میں گنہگار کیا عذر لاؤں؟

کون ہے جو آج میری شفاعت کرے!

جب اولیا خود دستگیری کے محتاج ہیں۔

خبیث روح

تجھے دیکھ کر روشن ضمیر

منہ پھیر لیتے ہیں۔

تجھ سے ہاتھ ملاتے پاک بازوں کو

گھن آتی ہے

افسوس!

کورس

ہائے میں گنہگار کیا عذر لاؤں؟

گریٹشن

اری بہن! ذرا اپنی شیشی تو دینا۔
(غش کھا کر گر پڑتی ہے)

والپرگس کی رات

ہارتس پہاڑ، شیرکے اور ایلینڈ کی نواح

شیطان: تیرا جی جھاڑو[1] پر سوار ہونے کو نہیں چاہتا؟ مجھے تو ایک موٹا تازہ بکرا چاہیے۔ منزل دور ہے، اس طرح پیدل چلیں تو خدا جانے کب پہنچیں گے۔

فاؤسٹ: جب تک میرے پیروں میں چلنے کی قوت ہے میرے لیے یہ گرہ دار ڈنڈا کافی ہے۔ آخر راستہ جلد طے کر لینے سے فائدہ کیا ہوگا؟ وادیوں کی بھول بھلیوں میں آہستہ آہستہ چلنا، اونچی چٹانوں پر چڑھنا، سدا جاری چشموں کو ابلتے ہوئے دیکھنا، یہ ہیں وہ دلچسپیاں جن کی بدولت رہ نوردی کا مزا آتا ہے۔ بید مجنوں کے دل میں بہار کی لہر اٹھ رہی ہے اور صنوبر بھی اسی ترنگ میں مست ہے، پھر یہ کیف ہمارے اعضاء میں کیوں نہ سرایت کر جائے۔

شیطان: مجھ پر تو اس کا خاک بھی اثر نہیں، میرے جسم میں سردی بسی ہوئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ راہ میں پالے اور برف کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس دیر طلوع چاند کے سرخی مائل قرص میں کیسی افسردگی، کیسی بے کیفی ہے، اس رندھی ہوئی چاندنی میں رستہ صاف نظر نہیں آتا۔ ہر قدم پر کسی درخت یا چٹان سے ٹکرانے کا خوف ہے۔ اجازت ہو تو میں کسی اگیا بیتال کو بلاؤں۔ لو وہ ایک نظر آ گیا۔ کیا مزے کی روشنی ہے! ارے بھائی سنتے ہو، ذرا ادھر آنا۔ کیوں اپنی چمک بیکار کھوتے ہو؟ مہربانی کر کے ذرا ہمیں رستہ دکھا دو۔

اگیا بیتال: شاید آپ کے ادب سے میں اپنے لا ابالی مزاج کو بدل سکوں عام طور پر تو ہم لوگوں کی چال لہردار ہوتی ہے۔

شیطان: چلتا ہے یا باتیں بناتا ہے؟ آیا بڑا انسان کی نقل کرنے والا! شیطان کا نام لے اور

---

[1] مشہور ہے کہ والپرگس کی رات کو جادوگرنیاں اور چڑیلیں جھاڑو پر یا بکرے پر سوار ہو کر شیطان کے دربار میں جاتی ہیں۔

سیدھا چلا چل۔نہیں تو میں تیری زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ایک پھونک میں بجھادوں گا۔
اگیا بیتال: میں جان گیا کہ آپ ہی ہمارے مالک ہیں۔سر آنکھوں سے آپ کے حکم پر چلوں گا مگر یہ سمجھ لیجئے کہ سارا پہاڑ آج جادو سے بدمست ہے۔آپ اگیا بیتال کو رہنما بناتے ہیں۔اگر بھٹک جائیں تو آپ جانیں۔

فاؤسٹ' شیطان' اگیا بیتال

(باری باری سے گاتے ہیں)

ایسا معلوم ہوتا ہے
ہم جادو اور خواب کے طلسم میں
مارے مارے پھرتے ہیں۔
ہمیں راہ دکھا' تیری عزت بڑھے
اور ہم جلدی سے پہنچیں
اس لق ودق صحرا میں۔
دیکھو یہ درخت ایک کے بعد ایک
کس تیزی سے گزرتے ہیں
پہاڑیاں جھکی سی جاتی ہیں
اور ہوا کا جھکڑ
چٹانوں سے ٹکرا کر
عجیب مہیب آواز پیدا کرتا ہے۔
ندی نالے پہاڑوں اور چراگاہوں میں
تیزی سے بہتے چلے جارہے ہیں؛
کیا میرے کانوں میں
نغمہ مستانہ اور نالۂ دل دوز کی صدائیں آرہی ہیں؟
کیا میں اس گزری ہوئی فردوسی زندگی کی پُر تاثیر آواز،

یعنی درد محبت کی دلکش فریاد،
سن رہا ہوں؟
ہائے ہماری امیدیں! ہائے ہمارا عشق!
اس زندگی کی صدائے بازگشت
سنی سنائی کہانیوں کی طرح
میرے کانوں میں گونج رہی ہے
سنو وہ گھگھو کی آواز آ رہی ہے
کیا سب رات کی چڑیاں جاگ رہی ہیں؟
کیا یہ جھاڑیوں میں سمندر رینگ رہے ہیں؟
یہ لمبی ٹانگوں اور موٹی توند والے جانور!
درختوں کی جڑیں ریت اور چٹان سے سر نکالے
سانپوں کی طرح بل کھا رہی ہیں
تاکہ ہمیں ڈرائیں اور گرفتار کر لیں
سوکھے درختوں میں جان پڑ گئی ہے؛
وہ اپنے پنجے مکڑی کی طرح
راہرو کی طرف بڑھاتے ہیں
چوہے گروہ در گروہ
نیچی جھاڑیوں اور کائی میں پھر رہے ہیں،
اور چمکدار جگنوں دل کے دل
اس پریشان جلوس کے ہمراہ ہیں
مگر یہ تو بتا ہم کھڑے ہیں
یا آگے بڑھ رہے ہیں؟
ہر چیز گھومتی نظر آ رہی ہے
پہاڑیاں اور درخت منہ چڑا رہے ہیں

جدھر دیکھو بے شمار اگیا بیتال چمک رہے ہیں۔

شیطان: ڈرو مت میرا دامن تھام لو۔ یہ ایک چھوٹی سی چوٹی ہے جہاں سے اس پہاڑ کی شیطانی دولت کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

فاؤسٹ: سارے پہاڑ پر یہ شفق صبح سے ملتی جلتی بھیانک روشنی پھیلی ہوئی ہے بلکہ گہرے کھڈ کی تہہ تک اتر گئی ہے۔ کہیں بھاپ اٹھ رہی ہے کہیں دم گھونٹنے والی گیس امنڈ رہی ہے۔ کہر کے باریک پردے میں ایک چمک سی جو کبھی باریک دھاگے کی طرح نظر آتی ہے اور کبھی چشمہ کی طرح ابلتی ہے۔ کہیں دامن کوہ میں دور تک جال کے مانند پھیلی ہوئی ہے اور کہیں ایک کونے میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ وہ دیکھو سامنے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں سنہری ریت کی طرح دہکتی ہیں مگر اس روشنی کی پوری آب و تاب اس پہاڑی کی چوٹی پر نظر آتی ہے۔

شیطان: ہاں دولت کے دیوتا نے اس دعوت کی تقریب میں سارے محل کو جگمگا دیا ہے۔ اپنی قسمت کو دعا دے کہ تو نے یہ تماشا دیکھا۔ مجھے تو ابھی سے اودھمی مہمانوں کا شور سنائی دیتا ہے۔

فاؤسٹ: ہوا کیسی دیوانہ وار چل رہی ہے۔ میری گردن پر اس کے تھپیڑے پڑ رہے ہیں۔

شیطان: تو اس چٹان کی پسلیوں کو مضبوط پکڑ لے ورنہ یہ ہوا تجھے نیچے کھڈ میں گرا دے گی۔ کہر نے رات کو تاریک کر دیا ہے۔ سن: جنگلوں میں کس غضب کا جھکڑ چل رہا ہے۔ اُلو ڈر سے ادھر ادھر چھپتے پھرتے ہیں۔ سن! قصر فطرت کے سدا بہار ستون پھٹے جاتے ہیں شاخیں ٹوٹ کر دھم دھم گر رہی ہیں۔ معاذ اللہ! یہ تنوں کی چرچراہٹ یہ جڑوں کے اکھڑنے کی آواز! درخت گر گر کر بے ترتیبی سے ایک پر ایک ڈھیر ہو رہے ہیں۔ پہاڑوں کے درے ان سے پٹے ہوئے ہیں اور ان کے بیچ سے ہوائیں سرسراتی اور چیختی ہوئی چل رہی ہیں تو یہ صدائیں سنتا ہے جو اوپر سے دور سے نزدیک سے آ رہی ہیں؟ سارے پہاڑ پر اس سرے سے اس سرے تک جادو کا گیت گونج رہا ہے۔

جادوگرنیوں کا کورس

جادوگرنیاں براکن کو چلیں
بالیاں ہری ہیں ڈنٹھل سوکھے ہیں

سری برادری وہاں اکٹھی ہے
اور صدر میں حضرت فلاں بیٹھے ہیں
پہاڑ اور جنگل میں بڑھے چلو

ایک آواز

بڑھیا باؤبوا کیلی آئی
ایک سوریا پر سوار

کورس

عزت والوں کی عزت کرو!
باؤبو بی بی آگے ہوں
موٹی تازی سوریا پر
اور ہم سب ان کے پیچھے ہوں۔

ایک آواز

تو کس رستے سے آئی۔

دوسری آواز

الزن اشطائن سے ہو کر
اُلو گھونسلے میں بیٹھا تھا
دیدے نکالے گھورتا تھا۔

تیسری آواز

چل جا جہنم میں!
آخر اتنی تیزی کیوں؟

کورس

رستہ خاصا چوڑا ہے
پھر یہ دھکم دھکا کیوں؟
جھاڑو چبھتی ہے پنجہ گڑتا ہے
بچے کا گلا گھٹتا ہے
ماں کا پیٹ پھٹتا ہے۔

جادوگروں کا کورس

ہم کچھوے کی چال چلتے ہیں
عورتیں دور نکل گئیں،
جب شیطان کے گھر جانا ہو
عورت ہزار قدم آگے رہتی ہے۔

جادوگرنیوں کا کورس

ہم کیوں اس کا برا مانیں،
عورت ہزار قدم چلتی ہے
مگر وہ لاکھ تیزی کرے
مرد نے ایک چھلانگ بھری اور جا پہنچا۔

آواز (اوپر سے)

آؤ اوپر آ جاؤ،
پہاڑی جھیل کو چھوڑو۔

آوازیں (نیچے سے)

ہمیں خود بلندی کی آرزو ہے؛

ہم نہا دھو کر صاف ہو گئے
مگر اولاد سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔

دونوں کورس

ہوا تھم گئی، ستارے ڈوب گئے؛
جادو کا کورس دیپک گاتا ہے
ہزاروں شعلے اٹھتے ہیں۔

آواز (نیچے سے)

ٹھہرو! ٹھہرو!

آواز (اوپر سے)

نیچے درے سے کون پکارتا ہے؟

آواز (نیچے سے)

مجھے بھی لے چلو! مجھے بھی لے چلو!
میں تین سو سال سے چڑھ رہا ہوں
مگر چوٹی پر نہیں پہنچ جاتا
اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچنے کو تڑپتا ہوں۔

دونوں کورس

کوئی جھاڑو پر سوار، کوئی ڈنڈے پر سوار،
کوئی پنجے پر سوار، کوئی بکرے پر سوار،
جو رہ گیا آج کے دن نیچے
وہ ہمیشہ کے لیے گیا گزرا۔

نوسکھیا جادوگرنی

میں کب سے ٹھوکریں کھاتی ہوں
اور سب اتنی دور کیوں کر پہنچے؟
گھر پر مجھے چین نہیں آتا۔
اور یہاں قدم نہیں اٹھتا۔

جادوگروں کا کورس

جادو کا ضماد لگانے سے دل بڑھتا ہے؛
کسی برتن میں بیٹھ جاؤ
اور چیتھڑے کا بادبان لگالو
وہ جہاز کی طرح چلتا ہے
جو آج نہ اڑا کبھی نہ اڑے گا

دونوں کورس

جب ہم چوٹی پر پہنچ جائیں
تو سب کے سب اتر پڑو
اور ساری جھاڑیوں میں
ٹڈیوں کی طرح پھیل جاؤ۔

(سب اتر پڑتے ہیں)

فاؤسٹ: معاذ اللہ! یہ دھکم دھکا، یہ چیخم دھاڑ، یہ دھما چوکڑی، یہ غل غپاڑا، یہ چمک دمک، یہ تپش، یہ بدبو!

شیطان: جادوگرنیوں کا حلقہ ایسا ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ مضبوط پکڑ لے ورنہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ تو کہاں ہے؟

فاؤسٹ: (دور سے) یہاں!

شیطان: ارے وہاں پہنچ گیا! ابھی سے ریلے میں آ گیا اب مجھے حکومت سے کام لینا پڑے گا۔ ہٹو، بچو، فولانڈ صاحب کی سواری آتی ہے۔ لے علامہ، میرا ہاتھ پکڑ لے۔ چل اس مجمع سے نکل چلیں۔ اس طوفان بدتمیزی سے تو میرا جیسا شخص بھی گھبرا گیا۔ وہ دیکھ تھوڑی دور پر کچھ روشنی سی نظر آتی ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کی چمک ہے۔ میرا دل بے اختیار اس جھاڑی کی طرف کھچا جاتا ہے۔ آ، چپکے سے کھسک چلیں۔

فاؤسٹ: تو بھی عجب مجموعہ اضداد ہے! خیر میں چلتا ہوں جہاں جی چاہے لے چل مگر میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا عقلمندی ہے۔ کیا ہم والپرگس کی رات کو اتنی دور چل کر بروکن پر اسی لیے آئے ہیں کہ یہاں پہنچ کر سب سے الگ جا بیٹھیں۔

شیطان: دیکھ کیسے رنگ برنگ کے شعلے ہیں! یہ بھی ایک دلچسپ صحبت ہے، بجائے خود ایک چھوٹی سی انجمن ہے۔

فاؤسٹ: مگر میرا جی تو وہیں رہنے کو چاہتا ہے۔ دیکھ کیسی روشنی ہے اور دھوئیں کے بگولے اٹھ رہے ہیں۔ لوگ ابلیس کے سلام کو اڈے چلے آتے ہیں وہاں بہت سے معمے حل ہوں گے۔

شیطان: مگر بہت سی نئی گھتیاں بھی پڑ جائیں گی۔ دنیا کو ہنگامہ برپا کرنے دے ہم یہاں تنہائی میں بسیرا لیں گے۔ یہ تو ہوتا چلا آیا ہے کہ بڑی دنیا کے اندر انسان اپنی چھوٹی دنیا الگ بنا لیتا ہے۔ وہ دیکھ نوجوان جادوگرنیاں ننگی کھڑی ہیں اور بڑھیوں نے ہوشیاری سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میری خاطر ذرا دیران سے ہنس بول لے۔ تھوڑی سی زحمت ہے مگر بڑا لطف آئے گا۔ باجوں کی آواز سے کان پھٹے جاتے ہیں۔ اس کی بھی انسان کو عادت ڈالنی چاہیے۔ میرے ساتھ چل۔ تجھے اس سے مفر نہیں۔ میں جاؤں گا اور تجھے بھی لے جاؤں گا۔ ہمارے عہد کی تجدید ہو گی۔ بتا دوست اب کیا کہتا ہے؟ یہ بھی کوئی چھوٹی سی جگہ نہیں جہاں تک نظر جاتی ہے جلسہ جما ہوا ہے۔ ایک قطار میں سوالا دجل رہے ہیں۔ کہیں ناچ ہو رہا ہے، کہیں گپ اڑ رہی ہے، کہیں کھانا پک رہا ہے، کہیں شراب لنڈھائی جا رہی ہے، بوس و کنار کے مزے لوٹے جا رہے ہیں۔ بتا اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا چیز ہے؟

فاؤسٹ: تو یہاں جادوگر بن کر جائے گا یا شیطان بن کر؟

شیطان: میں اکثر بھیس بدل کر پھرتا ہوں مگر دربار کے دن تو تمغے دکھانے کی بہار ہے۔ مجھے

گھٹنے پر فیتہ باندھنے[1] کی عزت حاصل نہیں۔ میرا مارکہ یہ گھوڑے کے سم ہیں۔ دیکھو وہ گھونگا رینگتا ہوا آ رہا ہے۔ اس کی ٹٹولنے والی نظر نے پہلے ہی بھانپ لیا کہ میں کون ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو یہاں چھپ نہیں سکتا۔ چل اب ہر الاؤ کے پاس چلیں۔ تو شادی کا خواستگار ہے اور میں تیری طرف سے معاشقہ کرتا ہوں۔

(فاؤسٹ کو لے کر چند لوگوں کے پاس جاتا ہے جو الاؤ کے گرد بیٹھے تاپ رہے ہیں)

بڑے میاں یہ آپ الگ کیوں بیٹھے ہیں؟ میں تو تب آپ کی تعریف کرتا جب آپ مجمع کے بیچوں بیچ ڈٹے ہوتے اور نوجوانوں کی رنگ رلیوں میں ڈوب جاتے۔ اکیلا رہنے کے لیے گھر پر بہت کافی موقع ہے۔

جنرل: قوموں پر کون بھروسا کر سکتا ہے! انسان ان کے لیے کتنا کچھ کرے مگر یہ عورتوں کی طرح نوجوانوں پر جان دیتی ہیں۔

وزیر: آج کل لوگ سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں اگلے زمانے والے پھر غنیمت تھے۔ عہد زریں وہی تھا جب ہمارا دور دورہ تھا۔

نودولت: ہم لوگ بھی آخر بیوقوف نہ تھے۔ ہم نے بھی بہت سے گناہ کیے لیکن آج کل تو ہر چیز الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جو حالت تھی وہی رہے۔

مصنف: آج کل کوئی ایسی کتاب نظر سے نہیں گزرتی جس میں اوسط درجہ کا مضمون بھی ہو مگر ہمارے پیارے نوجوان اپنے آپ کو ارسطو سے کم نہیں سمجھتے۔

شیطان: (جو دفعتاً بہت ضعیف نظر آتا ہے)

جادوگرنیوں کے پہاڑ پر آخری بار چڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ قیامت کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور چونکہ میرا چشمہ زندگی خشک رہا ہے اس لیے دنیا کا خاتمہ بھی قریب ہے۔

جادوگرنی: (جو عجائبات کی دکان لگائے ہے)

صاحبو کہاں جاتے ہو ذرا ٹھہرو! اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو! میرے مال کو غور سے دیکھو۔ طرح طرح کی چیزیں رکھی ہیں۔ میری بینظیر دکان میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جس سے کبھی

---

1. انگلستان کے Order of Garter کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

انسان کو اور دنیا کو نقصان نہ پہنچا ہو۔ کوئی خنجر ایسا نہیں جس سے خون نہ ٹپک چکا ہو۔ کوئی پیالہ ایسا نہیں جس سے زہر قاتل نہ پیا گیا ہو' کوئی زیور ایسا نہیں جس سے کوئی بھولی بھالی نازین نہ پھسلائی گئی ہو' کوئی تلوار ایسی نہیں جس کا وار حریف پر پشت کی طرف سے نہ ہوا ہو۔

شیطان: خالہ جان' تم زمانے کی ہوا نہیں پہچانتیں جو گزر چکا اسے بھول جاؤ۔ اب نئی چیزوں کی دکان لگاؤ۔ دلکشی صرف نئی چیزوں میں ہوتی ہے۔

فاؤسٹ: کہیں میں اپنے آپ کو نہ بھول جاؤں' کیا ٹھکانا ہے اس میلے کا!

شیطان: سارا مجمع اوپر جانے کے لیے دھکم دھکا کرتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کو ریلتا ہے حالانکہ خود ریلے میں بہا چلا جاتا ہے۔

فاؤسٹ: ارے یہ کون ہے؟

شیطان: غور سے دیکھ یہ للتھ ہے؟

فاؤسٹ: للتھ کون؟

شیطان: آدم کی پہلی بیوی' ہوشیار رہنا اس کے خوبصورت بالوں سے بچی اس کی زینت ہے۔ یہی اس کا زیور ہے جہاں کوئی نوجوان اس دام میں گرفتار ہوا پھر اس کی رہائی سہل نہیں ہے۔

فاؤسٹ: وہ دیکھو دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ ایک بوڑھی ایک نوجوان ان کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ ناچتے ناچتے تھک گئی ہیں۔

شیطان: آج کے دن تو بس ناچ ہی ناچ ہے۔ وہ دیکھو پھر شروع ہو گیا آؤ ہم بھی جٹ جائیں۔

(فاؤسٹ ایک نازنین کے ساتھ اور شیطان ایک بڑھیا کے ساتھ ناچتا ہے)

تخیل کا محتسب: کمبخت روحو تم کیا کر رہی ہو؟ کیا براہین قاطعہ سے یہ ثابت نہیں کر دیا گیا کہ کوئی روح سچ مچ کی ٹانگوں پر نہیں کھڑی ہو سکتی اور تم انسان کی طرح کھڑی ہو بلکہ ناچ بھی رہی ہو؟

نازنین (ناچتے ہوئے)

یہ مواہمارے ناچ میں کہاں سے گھس آیا؟

فاؤسٹ: ارے یہ تو سب کہیں پہنچتا ہے۔ دوسرے ناچتے ہیں تو یہ تنقید کرتا ہے۔ اگر یہ ہر قدم پر تبصرہ نہ کر سکے تو گویا کوئی قدم اٹھایا نہیں گیا۔ سب سے زیادہ غصہ اسے اس پر آتا ہے کہ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اگر کوئی کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ چکر کاٹا کرے جیسے یہ اپنی پرانی پن چکی میں کرتا ہے تو یہ اس کی تعریف کرے گا خصوصاً اگر اس کی خوشامد کی جائے۔

تخیل کا محتسب: تم ابھی تک موجود ہو! کیسا اندھیر ہے! بس معدوم ہو جاؤ ہم نئی روشنی پھیلا چکے ہیں۔ یہ کمبخت شیطان کی اولاد کسی اصول کی پابند نہیں۔ ہم اتنے دانش مند ہو گئے۔ اس پر بھی ٹیگل[1] میں بھوت نظر آتے ہیں۔ میں کتنے دن سے ان ادہام باطلہ کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر دنیا کسی طرح ان سے پاک نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر کیا اندھیر ہوگا!

نازنین: تو کیوں ہمارا دماغ چاٹ رہا ہے؟

تخیل کا محتسب: سوا روحو میں تمہارے منہ پر کہتا ہوں مجھے اس بھوت گردی کی برداشت نہیں۔ میرا دماغ اسے ادراک و تعقل میں ترتیب دینے سے قاصر ہے۔

(ناچ برابر ہو رہا ہے)

معلوم ہوتا ہے آج مجھے کامیابی نہ ہوگی۔ میں ہمیشہ سفر کرنے کو تیار رہتا ہوں مگر آخری سفر سے قبل ان شاء اللہ ان شیطانوں اور شاعروں کا سر کچل دوں گا۔

شیطان: اب یہ جا کر کیچڑ میں بیٹھے گا۔ جب اس کے کولہے میں جونکیں چمٹیں گی تو اس کے دماغ سے بھوتوں کا مسئلہ بلکہ خود دماغ ہی غائب ہو جائے گا۔

(فاؤسٹ سے جو ناچ کے حلقے سے نکل آیا)

تو نے اس حسینہ کو کہاں چھوڑا جو تیرے ساتھ ناچ رہی تھی اور میٹھے میٹھے گیت گا رہی تھی؟

فاؤسٹ: ارے لاحول ولاقوۃ! اس کے منہ سے تو گاتے وقت ایک لال چوہیا نکل پڑی۔

شیطان: اچھا ہوا۔ یہ کون سی برا ماننے کی بات ہے۔ لال ہی چوہیا تھی بھوری تو نہ تھی۔ بھلا ایسی رنگ رلیوں میں اس کا خیال کون کرتا ہے۔

---

1. برلن کی نواح میں ایک قصبہ ہے۔

فاؤسٹ: اس کے بعد............

شیطان: کیوں تو کہتے کہتے چپ کیوں ہو گیا؟

فاؤسٹ: تو دیکھتا ہے۔ وہ لڑکی جس کا چہرہ اترا ہوا ہے سب سے الگ اکیلی کھڑی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گھسٹ رہی ہے جیسے اس کے پیر بندھے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی شکل پیاری گریٹشن سے ملتی ہے۔

شیطان: ارے اس قصہ کو چھوڑ' اس میں کسی کا بھلا نہیں۔ یہ ایک جادو کی پتلی ہے' ایک پیکر بیجان' ایک بت۔ اس سے آنکھ ملانا ٹھیک نہیں۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس طرح دیکھتی ہے کہ انسان کا خون خشک ہو جائے اور وہ پتھر بن کر رہ جائے۔ تو نے میڈوسا[1] کا حال تو سنا ہو گا۔

فاؤسٹ: واقعی یہ مردے کی سی آنکھیں ہیں جنہیں مرتے وقت کسی محبت کرنے والے نے بند نہیں کیا مگر یہ تو وہی سینہ ہے جس سے گریٹشن مجھ سے لپٹی تھی۔ وہی پیارا جسم ہے جس سے میں نے اختلاط کیا تھا۔

شیطان: ارے زود اعتقاد احمق یہ جادو کا کھیل ہے۔ ہر شخص کو اس میں اپنی معشوقہ کی صورت نظر آتی ہے۔

فاؤسٹ: ہائے یہ لذت! ہائے یہ درد! میں ان آنکھوں سے نظر نہیں ہٹا سکتا۔ اس خوبصورت گلے میں یہ لال مالا جو چاقو کے پھل سے زیادہ چوڑی نہیں کیسی بھلی معلوم ہوتا ہے۔

شیطان: ہاں! ہاں! میں نے بھی دیکھا۔ وہ کبھی کبھی اپنا سر جسے پرسیس نے کاٹا تھا بغل میں دبا لیتی ہے۔ تیرے دل سے ابھی تک ان اوہام کا شوق نہیں گیا۔ آ' ذرا اس پہاڑی پر چلیں وہاں وئینا کے پراٹر[2] کا لطف آتا ہے۔ اگر میری آنکھیں دھوکا نہیں دیتیں تو تھیٹر کا سا تماشا ہو رہا ہے۔ کون سا ناٹک ہے؟

ایک زائد ایکٹر: دیکھئے اب ایک اور ناٹک شروع ہوتا ہے۔ یہاں سات تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ چھ ہو چکے۔ اب یہ ساتواں ہے۔ یہ ایک اناڑی ڈرامہ نگار نے لکھا ہے اور اناڑی ایکٹر اسے کھیل رہے ہیں۔ معاف کیجئے گا مجھے جانا ہے کیونکہ اناڑی پن سے پردہ اٹھانے کا کام

---

1. قدیم یونانی دیو مالا میں وہ عجیب الخلقت مخلوق جس سے آنکھ ملاتے ہی لوگ پتھر کے ہو جاتے تھے۔
2. وئینا پایہ تخت آسٹریا میں عوام کی تفریح گاہ جہاں روز سہ پہر کو میلا لگتا ہے۔

میرے ہی سپرد ہے۔

شیطان: بلاکس برگ میں تمہارا ہونا ٹھیک ہے۔ یہی جگہ تمہارے لیے موزوں بھی ہے۔

والپرگس کی رات کا خواب

اوبیرون[1] اور ٹٹانیا کی سنہری شادی[2]

منیجر: میڈنگ کے سپوتو آج تمہارے آرام کا دن ہے کیونکہ آج کا سارا سین بس ایک پرانا پہاڑ اور ایک بھیگی ہوئی وادی ہے۔

نقیب: سنہری شادی نکاح کے پچاس برس گزرنے کے بعد منائی جاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک تو جب میاں بیوی کی دانتا کل کل ختم ہو جائے تب ہی سنہری شادی ہے۔

اوبیرون: اے روح اگر تم یہاں ہو تو ظاہر ہو جاؤ۔ بادشاہ اور ملکہ میں پیمان محبت کی تجدید ہو رہی ہے۔

پک: پک ترچھی چال سے آتا ہے اور توڑے لے کرنا چتا ہے۔ پھر اور بہت سی روحیں اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے آتی ہیں۔

ایریل: ایریل پاک آسمانی سروں میں اپنا گیت چھیڑتا ہے۔ اس کی سحر نوائی کی کشش سے کھوسٹ بڑھیوں سے لے کر مہ لقا نازنینیں تک کھچی چلی آتی ہیں۔

اوبیرون: اگر میاں بیوی آپس میں نباہنا چاہتے ہوں تو ہم سے سبق لیں۔ دو آدمیوں میں محبت جب ہی قائم رہ سکتی ہے کہ ایک دوسرے سے الگ رہیں۔

ٹٹانیا: اگر میاں گال پھلائے اور بیوی منہ تھتائے تو انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دو۔ بیوی کو دکھن کی طرف لے جاؤ اور میاں کو اتر کے سرے پر پہنچا دو۔

باجے کی سنگت (اونچے سر میں)

مکھی کا گلا (1)[3]

---

1. قدیم انگلوسکسن دیو مالا میں اوبیرون جن و پری کا بادشاہ اور ٹٹانیا ملکہ تھی۔
2. شادی کے پچاس برس بعد اگر میاں بیوی دونوں زندہ ہوں تو سنہری شادی منائی جاتی ہے۔
3. (1) تا (5) یہ سب روحوں کے نام ہیں۔

مچھر کی ناک (2)
اور ان کا سارا کنبہ
گڑھیا کا مینڈک (3)
اور گھاس کا جھینگر (4)
یہ ہمارے گویّے ہیں

اکیلا باجا

وہ دیکھو صابون کا بلبلا (5)
وہ ہماری تُرہی ہے
اس کی بھدی ناک سے
سوں سوں کی آواز سنو۔

روح (جو ابھی بن رہی ہے)

مکڑی کے پیر اور مینڈک کا پیٹ،
اور چھوٹے چھوٹے پنکھ،
ان سے چاہے کوئی جانور نہ بنے
مگر ایک شعر تو بن جائے گا۔

ناچنے والوں کا جوڑا

چھوٹے قدم اور لمبے توڑے
پھولوں کی عطر بار فضا میں،
شہد سی شبنم کے فرش پر؛
بیشک تو بہت تیز رفتار ہے
مگر نسیم سحری کے برابر نہیں۔

متجسس سیاح

کہیں یہ بہروت کا کھیل تو نہیں
میری نظر مجھے دھوکا تو نہیں دیتی
کیا میں واقعی آج یہاں
حسین دیوتا' اوبیرون' کو دیکھ رہا ہوں؟

ایک راسخ العقیدہ بزرگ

نہ اس کے دُم ہے اور نہ پنجے
مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔
کہ یونان کے دیوتاؤں کی طرح
یہ بھی شیطان ہے۔

شمالی صناع

آج میں کچھ دیکھ رہا ہوں
یہ محض ایک خاکہ ہے؛
مگر ایک دن وہ بھی آئے گا
جب میں اطالیہ کا سفر کروں گا۔

زبان داں

افسوس! میری شامت تھی کہ میں یہاں آیا؛
لوگ کیسے کیسے ثقیل الفاظ استعمال کر رہے ہیں
اور ان ساری چڑیلوں میں
صرف دو کے سر پر "وگ"[1] ہے۔

---

1 مصنوعی بال "گوئٹے" کے زمانے تک 'فرانس' کی تقلید میں مصنوعی بال پہننے کا فیشن تھا۔

نوجوان جادوگرنی

"وگ" ہو یا قبا
یہ سب کھوسٹ بڑھیوں کے لیے ہے
میں تو ننگی بکرے پر بیٹھی
اپنا گداز جسم دکھاتی ہوں۔

ادھیڑ جادوگرنی

تم چھوکریوں سے الجھنا
ہماری شان کے خلاف ہے
مگر اتنا میں ضرور کہوں گی
کہ تمہاری جوانی اور خوبصورتی میں کیڑے پڑیں۔

بینڈ ماسٹر

مکھی کے گلے اور مچھر کی ناک،
اس ننگی عورت کے پاس نہ کھڑے ہو؛
گڑھیا کے مینڈک اور گھاس کے جھینگر،
سُر کو چھوڑ کر بے سُرے نہ ہو جاؤ۔

مرغ بادنما (ایک رخ پر)

کیسی دل پذیر صحبت ہے!
جدھر دیکھو کنواریاں نظر آتی ہیں
اور اسی تعداد میں کنوارے ہیں؛
انہیں لوگوں کے سروں پر امیدوں کا سایہ ہے۔

(دوسرے رخ پر)

اگر ابھی زمیں پھٹ کر
ان سب کو نگل نہ گئی
تو میں دوڑ کر
جہنم میں کود پڑوں گا۔

بینڈ ماسٹر

گڑھیا کے مینڈک اور گھاس کے جھینگر؛
تم دونوں کمبخت اتائی ہو
مکھی کے گلے اور مچھر کی ناک
تم اسی برتے پر گوئیے بنتے تھے۔

عمدہ ناچنے والے

جتنے رند ہیں سب کے سب
بےفکرے کہلاتے ہیں؛
ہم پیروں سے ناچتے ناچتے تھک گئے
اب سر سے ناچنا شروع کرتے ہیں۔

پرانے ناچنے والے

ہم نے بڑے بڑے کمال دکھائے
مگر اب خدا ہی حافظ ہے!
ہمارے جوتے ناچتے ناچتے گھس گئے
اب ہم ننگے پیر ناچتے ہیں۔

شہاب ثاقب

میں اوج سما سے آتشی نور کے حلقے میں

زمین پر اترا؛
مگر اب گھاس پر پڑا ہوں اور کوئی اتنا نہیں
جو مجھے اٹھا کر کھڑا کر دے۔

موٹے لوگ

ہٹو جگہ دو! حلقہ باندھ کر کھڑے ہو!
ورنہ ساری گھاس کچل جائے گی؛
روحیں آ رہی ہیں
اور وہ بھی موٹی تازی ہوتی ہیں۔

پک

ہاتھی کے بچوں کی طرح
ایسے بھاری بھاری قدم نہ رکھو
آج کے دن تم سب میں
پک ہی سب سے موٹا ہے۔

اریل

محبت والی مادر فطرت نے،
روح کائنات نے، تمہیں پنکھ عطا کیے ہیں؛
میری طرح سبک رفتاری سے
گلاب کی پہاڑی پر چلو۔

باجے کی سنگت (بہت مدھم سر میں)

بادل کے ٹکڑے، اور کہر کی گھٹا،
کنج باغ میں نسیم اور بانسری میں نغمہ،

غرض ہر چیز منتشر ہو رہی ہے
سفیدۂ سحری نمودار ہو رہا ہے

گہر یلا دن

میدان

فاؤسٹ..........شیطان

فاؤسٹ: دکھ کی ماری! جان سے عاجز! نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھری اور اب گرفتار ہوگئی۔ وہ بدنصیب نازنین مجرموں کی طرح قید کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچی ہائے یہاں تک اور تو نے اے دغاباز نابکار روح یہ باتیں مجھ سے چھپائیں!
ٹھہر! کہاں جاتا ہے؟ اپنے شیطانی دیدے غصہ میں مٹکائے جا! اپنی نا قابل برداشت صحبت سے میرا جی جلائے جا! قید میں! اس مصیبت میں جس سے چھٹکارا نہیں! خبیث روحوں کے بس میں بیدرد نوع انسانی کے پنجۂ احتساب میں! اور مجھے تو نے اس عرصہ میں بھونڈی تفریحوں میں الجھائے رکھا' اس کی روز افزوں مصیبت کو مجھ سے چھپایا اور اس کو یاس اور بے کسی کے عالم میں برباد ہونے دیا۔

شیطان: وہ پہلی تو نہیں۔ دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار۔

فاؤسٹ: کتے! قابل نفرت راکھشس! اے روح مطلق اس کی قلب ماہیت کر دے! اسے پھر وہی کتا بنا دے جو راتوں کو میرے آگے آگے دوڑتا تھا' بے چارے مسافروں کے پیروں میں لپٹ کر انہیں گرا دیتا تھا اور ان کا گلا دباتا تھا۔ اس کی وہی شکل بنا دے جو اسے مرغوب ہے تاکہ یہ میرے آگے مٹی میں لوٹے اور میں اسے اپنے پیروں سے کچلوں! وہ پہلی نہیں! ہائے افسوس! صد ہزار افسوس! کون انسان اس تصور کی تاب لاسکتا ہے کہ ایک سے زیادہ مخلوق اس عذاب میں گرفتار ہے؟ ایک کا اس طرح ایڑیاں رگڑ کر مرنا اس ستار و غفار کی نظر میں اور سب کی نجات کے لیے کافی نہیں! میرا تو ایک ہی کی مصیبت دیکھ کر گوشت پوست گھلا جاتا ہے اور تو ہزاروں کو اس حال میں دیکھ کر اطمینان سے زہر خند کرتا ہے!!

شیطان: اب ہم اس نقطے پر پہنچ گئے جو تیرے ابنائے جنس کے طائر فکر کی حد پرواز ہے۔

تو نے ہم سے عہد رفاقت کیوں کیا جب تو اسے پورا نہیں کر سکتا؟ اڑنے کا حوصلہ وہ کرے جس کا سر نہ چکرائے۔ میں زبردستی تیرے پیچھے پڑا تھا یا تو میرے گلے کا ہار بن گیا تھا؟

فاؤسٹ: اے آدم خور میرے آگے دانت نہ پیس! مجھے گھن آتی ہے! اے بلند و برتر روح جس نے مجھے اپنا جلوہ دکھا کر سرفراز کیا' جو میرے دل کے بھید سے واقف ہے' تو نے کیوں اس مردود ساتھی کو مجھ پر مسلط کر دیا جو لوگوں کی مصیبت دیکھ کر نہال ہوتا ہے اور ان کی تباہی سے پنپتا ہے؟

شیطان: بس کہہ چکا یا کچھ اور کہنا ہے؟

فاؤسٹ: اس کو قید سے چھڑا! ورنہ تجھ پر خدا کی لعنت ہو ابد الآباد تک!

شیطان: میں منتقم حقیقی زنجیروں کو نہیں توڑ سکتا۔ اس کے قید خانے کے قفل کو نہیں کھول سکتا۔ میں اسے چھڑاؤں؟ اسے اس تباہی میں کس نے ڈالا؟ میں نے یا تو نے!

فاؤسٹ: (وحشت آمیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہے)

شیطان: کیا تو رعد و برق کی تلوار ڈھونڈ رہا ہے؟ اتنا اچھا ہے کہ تم فانی انسان کو یہ حربہ نہیں دیا گیا؟ جو بے گناہ سامنے پڑ جائے اسے کچل کر اپنے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنا یہ ظالموں کا ہمیشہ سے دستور ہے۔

فاؤسٹ: مجھے اس کے پاس لے چل! جیسے بنے اسے چھڑانا چاہیے۔

شیطان: مگر یہ سمجھ لے کہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ شہر میں تجھ پر خون کرنے کا الزام اب تک قائم ہے۔ مقتول کی قبر پر انتقام کی روحیں اب تک منڈلا رہی ہیں اور قاتل کے لوٹنے کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

فاؤسٹ: میری قسمت میں تھا کہ تجھ سے یہ باتیں سنوں! تجھ سے اے بے رحم راکھشس' جس کے سر پر ایک عالم کا خون ہے چل مجھے لے چل اور اس کو چھڑا!

شیطان: میں تجھے لے چلوں گا اور جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری طاقت میرے قبضے میں ہے؟ میں پہرے والوں کو بے ہوش کر دوں گا۔ تو قید خانے کی کنجی لے کر اسے نکال لانا۔ اسے انسان ہی کا ہاتھ کر سکتا ہے۔ میں دیکھتا رہوں گا کہ کوئی آنے نہ پائے۔ جادو کے گھوڑے تیار رہیں گے اور میں تجھے بٹھا کر لے جاؤں گا۔ یہ میرا کام ہے۔

فاؤسٹ: اچھا اٹھ اور فوراً چل!

رات

کھلا میدان

(فاؤسٹ اور شیطان کیت گھوڑوں پر سوار چلے جا رہے ہیں)

یہ لوگ را بن اشطائن کے پاس کیا کر رہے ہیں؟ جانے کیا چیز پکار رہے ہیں۔

فاؤسٹ: ارے یہ تو کبھی ہوا میں منڈلاتے ہیں، کبھی نیچے گرتے ہیں، کبھی سر ہلاتے ہیں، کبھی جھکتے ہیں۔

شیطان: یہ چڑیلوں کا جلسہ ہے۔

فاؤسٹ: وہ کوئی چیز پھینکتی جاتی ہیں اور منتر پڑھتی جاتی ہیں۔

شیطان: آگے بڑھ! آگے بڑھ!

قید خانہ

(فاؤسٹ ایک کنجیوں کا گچھا اور چراغ ہاتھ میں لیے ایک لوہے کے دروازہ کے سامنے کھڑا ہے)

آج مدت کے بعد میرے جسم پر لرزش طاری ہے۔ نوع انسانی کی ساری مصیبت کا بوجھ میرے دل پر ہے۔ وہ ان سیلی ہوئی دیواروں کے اندر رہتی ہے اور ایک دلفریب وہم نے اسے برباد کر دیا تو اس کے پاس جاتے جھجکتا ہے۔ اس سے آنکھ ملاتے ڈرتا ہے۔ جلدی چل تو اس حیص بیص میں ہے اور موت قدم بڑھائے آ رہی ہے۔

(وہ قفل کھولنے لگتا ہے، اندر سے گانے کی آواز آتی ہے؛

میری ماں بیسوا،
جس نے میری گردن مروڑی
میرا باپ خدائی خوار،
جو مجھے کچا نگل گیا،
میری ننھی سی بہن نے،

میری ہڈیاں ایک ٹھنڈی جگہ دفن کر دیں
پھر میں ایک حسین جنگلی چڑیا بن گئی!
اور ہر طرف اڑتی پھرتی ہوں۔

فاؤسٹ: اسے یہ خبر نہیں کہ اس کا عاشق کان لگائے بیڑیوں کی جھنکار اور پیال کی سرسراہٹ سن رہا ہے۔

(داخل ہوتا ہے۔)

مارگریٹ: (بستر میں چھپ جاتی ہے) ہائے لوگ آ گئے اب موت کا سامنا ہے۔

فاؤسٹ: چپ! چپ! میں تجھے چھڑانے آیا ہوں۔

مارگریٹ: (زمین پر گر پڑتی ہے) اگر تو انسان ہے تو میری مصیبت پر رحم کر۔

فاؤسٹ: تو چیخ چیخ کر پہرے والوں کو جگا دے گی۔ (بیڑیوں کو پکڑ کر کھولنا چاہتا ہے)

مارگریٹ: اے جلاد تجھے کس نے یہ اختیار دیا کہ مجھے آدھی رات کو لے جائے۔ رحم کر اور مجھے تھوڑی دیر اور جی لینے دے۔ کیا کل صبح تک ٹھہرنے میں کچھ دیر ہو جائے گی (وہ اٹھ بیٹھتی ہے) کیسی کم سنی میں مجھے جان دینا پڑا۔ میں حسین تھی اور اسی حسن نے مجھے برباد کیا۔ میرا دوست میرے پاس تھا اور اب دور ہے۔ سہرے کی لڑیاں ٹوٹ گئیں، پھول بکھر گئے، تو اس بیدردی سے میری بیڑیاں نہ کھینچ! مجھ پر رحم کر! کیا میری منتوں سے تیرا دل نہ پسیجے گا۔
آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ پہلے کبھی تیری صورت تک نہیں دیکھی!

فاؤسٹ: ہائے مجھ سے یہ روحانی اذیت نہیں سہی جاتی!

مارگریٹ: اب تو میں تیرے بس میں ہوں۔ مجھے اتنی مہلت دے کہ میں بچے کو دودھ پلا لوں۔ میں اسے ساری رات کلیجے سے لگائے رہی۔ ظالموں نے اسے مجھ سے چھین لیا اور کہتے ہیں کہ میں نے اسے مار ڈالا۔ اب مجھے کبھی خوشی نصیب نہ ہوگی۔ لوگ مجھ پر گیت بنا کر گاتے ہیں! ہائے یہ کیسا ستم ہے! ایک پرانی خواب کی سی کہانی یوں ختم ہو گئی، ان سے کس نے کہا ہے کہ اس کی تعبیر کریں؟

فاؤسٹ: (اس کے قدموں پر گرتا ہے) تیرا عاشق پیر پڑتا ہے کہ تجھے درد و الم سے چھڑائے۔

مارگریٹ: (اس کے قریب گھٹنوں کے بل جھکتی ہے)

آ ہم دونوں مل کر
خاصان خدا کو
مدد کے لیے پکاریں۔
دیکھ! سیڑھیوں کے نیچے
دہلیز کے قریب
جہنم کی آگ بھڑک رہی ہے
شیطان رجیم
غصے میں بھرا
چلا رہا ہے۔

فاؤسٹ: (بلند آواز سے) گریٹشن! گریٹشن!

مارگریٹ: (متوجہ ہو جاتی ہے) یہ تو میرے دوست کی آواز تھی! (وہ اچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ بیڑیاں ٹوٹ کر گرتی ہیں) وہ کہاں ہے؟ میں نے ابھی اس کے پکارنے کی صدا سنی تھی۔ میں آزاد ہوں! مجھے اب کون روک سکتا ہے؟ میں دوڑ کر اس کے گلے لگ جاؤں گی! اس نے ''گریٹشن'' کہہ کر پکارا تھا! وہ دہلیز پر کھڑا تھا۔ میں نے جہنم کے شور و شغب اور شیطان کی غضبناک طعن و تشنیع کے درمیان اس کی محبت بھری آواز پہچان لی۔

فاؤسٹ: غور سے دیکھ، میں ہی تو ہوں!

مارگریٹ: تو ہی ہے! ایک بار پھر کہہ (اس سے لپٹ جاتی ہے) ہاں بیشک تو ہی ہے! تو ہی ہے! اب وہ سارا درد والم کہاں گیا؟ وہ کال کوٹھری کا خوف؟ وہ زنجیروں کا ڈر؟ ہاں تو ہی ہے! مجھے چھڑانے آیا ہے! میری خلاصی ہو گئی! اب میری نظر کے سامنے وہ سڑک ہے جہاں میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ ہنستا ہوا باغ دہاں مارتھے اور میں تیرا انتظار کر رہی تھی۔

فاؤسٹ: (چلنے کا قصد کرتے ہوئے) آ میرے ساتھ چل! جلدی کر جلدی!

مارگریٹ: دم بھر ٹھہر! جہاں تو ہے وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ (پیار کرتی ہے)

فاؤسٹ: جلدی چل! ٹھہرنے میں بڑا خطرہ ہے۔

مارگریٹ: ہائیں! تو مجھے پیار نہیں کرتا؟ چند ہی دن کی جدائی میں بوسہ لینا بھول گیا؟ تیری آغوش میں میرا دل کیوں دھڑکتا ہے؟ پہلے تو تیری باتوں میں' تیری نظروں میں مجھے جنت کا لطف آتا تھا تو اتنے بوسے لیتا تھا کہ میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ مجھے پیار کر! ورنہ میں تجھے پیار کرتی ہوں!
(اس سے لپٹ جاتی ہے)

ہائے تیرے ہونٹ سرد ہیں
اور خاموش؛
وہ تیری محبت
کہاں گئی؟
مجھے کس نے اس سے محروم کر دیا؟
(منہ پھیر لیتی ہے)

فاؤسٹ: آ! میرے ساتھ چل! میری پیاری' دل کو مضبوط کر لے! میں تجھے ہزار گنا جوش سے گلے لگاؤں گا! میرے ساتھ چل! میری بس یہی التجا ہے۔

مارگریٹ: (اس کی طرف رخ کر کے) کیا تو ہی میرا عاشق ہے' تجھے پورا یقین ہے؟

فاؤسٹ: ہاں میں ہی ہوں! خدا کے لیے چل!

مارگریٹ: تو نے میری بیڑیاں توڑ دیں اور مجھے گلے لگایا مگر یہ کیا بات ہے کہ تجھے میرے پاس آتے گھن نہیں آتی۔ اے بھلے آدمی تجھے معلوم بھی ہے کہ تو کسے چھڑا رہا ہے؟

فاؤسٹ: جلدی چل! اندھیری رات گزری جاتی ہے۔

مارگریٹ: میں نے اپنی ماں کی جان لی' اپنے بچے کو دریا میں ڈبو دیا۔ کیا تیرا اور میرا نہیں تھا؟ تیرا بھی۔ تو ہی ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ ذرا اپنا ہاتھ ادھر لا! نہیں یہ خواب نہیں ہے کیا پیارا ہاتھ ہے۔ مگر یہ تو بھیگا ہوا ہے! اسے پونچھ لے! مجھے اس میں خون نظر آتا ہے۔ ہائے یہ تو نے کیا کیا! تلوار کو میاں میں کر لے! میں تیری منت کرتی ہوں۔

فاؤسٹ: گزری ہوئی باتیں بھول جا۔ میں اس صدمہ سے ہلاک ہو جاؤں گا۔

مارگریٹ: نہیں تجھے زندہ رہنا چاہیے! میں تجھے قبروں کا حال بتاتی ہوں۔ تو کل ہی صبح ان کی فکر کر۔ میری ماں کو سب سے اچھی جگہ دفن کرنا اور اس کے پاس میرے بھائی کو' مجھے ذرا ہٹ کر

مگر زیادہ دور نہیں، ننھے کو میرے داہنے پہلو میں۔ اور کسی کی قبر تو میرے قریب کا ہے کو بنے گی! تیرے سینے سے لپٹ کر مجھے کیسی راحت ملتی تھی! مگر اب خوشی کبھی نصیب نہ ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں زبردستی تیرے گلے کا ہار بن گئی تھی اور تو مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر تو ہی تو میرا عاشق ہے، تیری آنکھوں سے کیسی نیکی اور پارسائی ٹپکتی ہے۔

فاؤسٹ: اگر تجھے یہ احساس ہے کہ میں ہی تیرا چاہنے والا ہوں تو میرے ساتھ چلی آ!

مارگریٹے: وہاں؟

فاؤسٹ: آزادی کی کھلی ہوا میں۔

مارگریٹے: اگر وہاں قبر ہے اور موت میری راہ دیکھ رہی ہے تو میں چلتی ہوں! یہاں سے ابدی خواب گاہ میں مگر وہاں سے آگے ایک قدم بھی نہیں۔ کیا تو جاتا ہے؟ ہائن رش، کاش میں تیرے ساتھ چل سکتی!

فاؤسٹ: چل کیوں نہیں سکتی! چلنے پر راضی تو ہو! دروازہ کھلا ہے!

مارگریٹے: میری مجال نہیں کہ یہاں سے جاؤں۔ میری رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ بھاگنے سے کیا فائدہ؟ لوگ میری تاک میں ہیں۔ یہ کیا کم مصیبت ہوگی کہ بھیک مانگتی پھروں اور وہ بھی دل میں چور لیے ہوئے؟ یہ کیا کم مصیبت ہوگی کہ پردیس میں ٹھوکریں کھاتی پھروں؟ اور پھر ایک نہ ایک دن پکڑا جانا ضروری ہے۔

فاؤسٹ: تو پھر میں بھی تیرے پاس رہوں گا۔

مارگریٹے: جلدی جا! جلدی جا! اپنے معصوم بچے کی جان بچا۔ بس دیر نہ کر! چشمے کے کنارے کنارے سیدھا چلا جا اور پل سے گزر کر جنگل میں بائیں طرف مڑ جا جہاں تالاب تک ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، بچالے، بچالے!

فاؤسٹ: خدا کے لیے ہوش میں آ! بس جہاں ایک قدم اٹھایا پھر تو آزاد ہے!

مارگریٹے: کاش ہم اس پہاڑ کے پاس سے جلد گزر جاتے! وہ دیکھ میری ماں ایک چٹان پر بیٹھی ہے۔ مجھے ڈر سے ٹھنڈا پسینہ آتا ہے۔ میری ماں چٹان پر بیٹھی ہے اور اس کا سر ہل رہا ہے۔ وہ نہ بلاتی ہے نہ اشارہ کرتی ہے۔ اس کا سر بھاری ہے وہ اتنی دیر سوئی کہ اب کبھی نہ جاگے گی۔ اسے میں نے سلا دیا تھا کہ ہم دونوں بے کھٹکے ہم آغوشی کا لطف اٹھائیں۔ ہائے وہ بھی کیا اچھے دن تھے!

فاؤسٹ: نہ خوشامد سے کام چلتا ہے نہ سمجھانے سے۔ اب چاہے جو کچھ بھی ہو میں تجھے زبردستی اٹھائے لیے چلتا ہوں۔

مارگریٹے: خبردار ہاتھ نہ لگانا! مجھے اس زبردستی برداشت نہیں! تو کیوں جلاد کی طرح مجھے گھسیٹتا ہے؟ کیا میں نے ہمیشہ تیری ناز برداری نہیں کی؟

فاؤسٹ: دن نکلا چاہتا ہے! میری پیاری خدا کے لیے مان جا۔

مارگریٹے: دن؟ ہاں دن ہونے والا ہے؟ آخری دن آرہا ہے۔ یہ دن میری شادی کا تھا! کسی سے یہ نہ کہنا کہ تو گریٹشن کے پاس تھا! ہائے میرا سہرا! جو ہونا تھا وہ ہو گیا! اب ہم پھر ملیں گے مگر ناچ میں نہیں۔ لوگوں کا ہجوم ہے، سب خاموش ہیں، گلیوں میں اور چوک میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ موت کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ بانس ٹوٹ گیا۔ لوگ میری مشکیں کس رہے ہیں اور مجھے کھینچے ہوئے قتل گاہ میں لیے جا رہے ہیں۔ جلاد کی تیز تلوار جو پہلے اور گردنوں پر چمکی تھی اب میری گردن پر چمک رہی ہے۔ دنیا قبر کی طرح خاموش ہے۔

فاؤسٹ: آہ! کاش میں کبھی پیدا نہ ہوتا!

شیطان: (دروازے کے باہر نظر آتا ہے) اٹھو! ورنہ تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ آخر یہ فضول حیص بیص کب تک! یہ شش و پنج، یہ قیل و قال! میرے گھوڑے سردی میں کانپ رہے ہیں، صبح کی روشنی نمودار ہے۔

مارگریٹے: یہ زمین کے اندر سے کون سی شکل ظاہر ہوئی؟ یہ وہی ہے! وہی ہے! اسے یہاں سے نکال دے! اس پاک مکان میں اس کا کیا کام؟ یہ میری روح چاہتا ہے!

فاؤسٹ: تو زندہ رہے گی!

مارگریٹے: اے داور حقیقی! میں اپنی روح تجھے سونپتی ہوں۔

شیطان: چل! چل! ورنہ میں تجھے بھی اسی کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔

مارگریٹے: میں تیری ہوں اے آسمانی باپ! مجھے نجات دے! اے فرشتو! اے عالم قدس کے لشکرو! میرے گرد جمع ہو جاؤ اور میری حفاظت کرو۔ ہائنرش! تجھے دیکھ کر میرا دل لرزتا ہے۔

شیطان: اب یہ نہیں بچتی!

عالم بالا کی صدا

بچ گئی!

شیطان:(فاؤسٹ سے) آ میرے ساتھ!

(فاؤسٹ کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے)

قید خانے کے اندر سے آواز آ رہی ہے۔

ہائنرش! ہائنرش!
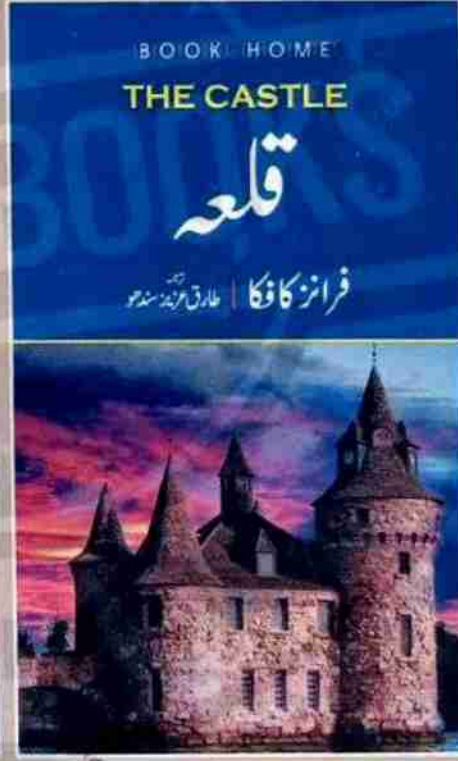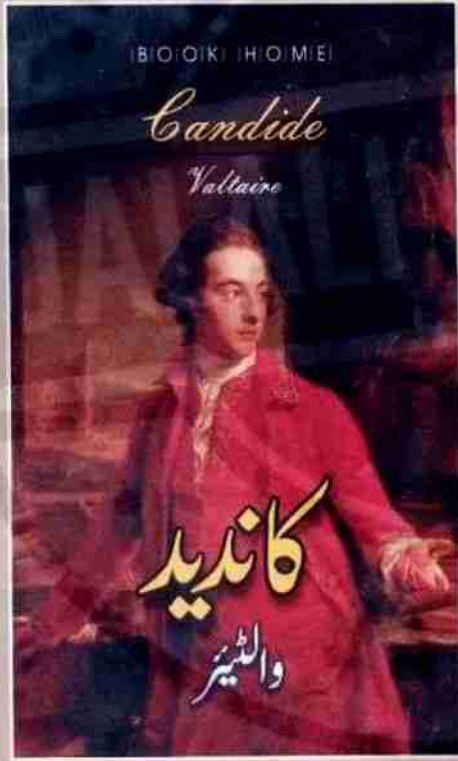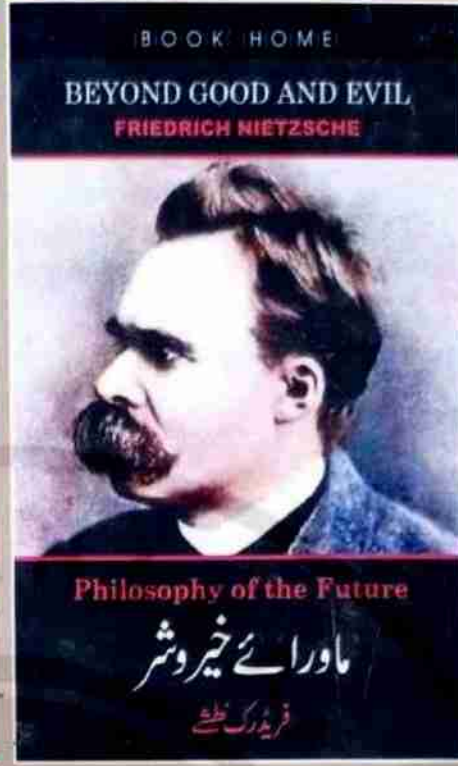
Design By:
MUHAMMAD AHSUN Gull

بک سٹریٹ 46 - مزنگ روڈ لاہور، پاکستان فون : 37245072 - 042-37231518

E-mail: bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www. bookhomepublishers.com